سید محمد تقی

کربلا — تہذیب کا مستقبل

کربلا — تہذیب کا مستقبل



سید محمد تقی

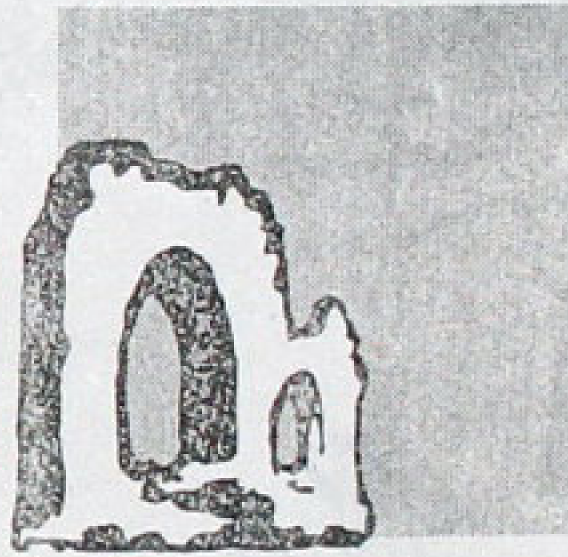
کلاسیک
42- دی مال، لاہور

آغا امیر حسین

ناشر و تاجر
کلاسیک
چوک ریگل۔ ۴۲ دی مال لاہور۔۔۔۵۴۰۰۰

فون:37312977 فیکس:37323963
E-mail:classicpublisher@yahoo.com
E-mail:classicpublisher@hotmail.com
www.classicpublishers.com

 O فروری 2012ء O قیمت: -/200 روپے



طابع:
سید ندیم حسین آغا
سپوتنک پرنٹرز
13-C فین روڈ لاہور
موبائل:0300-4442227
فون: 92-42-37355957
ای میل: nadeemagha8@hotmail.com

ترتیب

پیش لفظ

بیسویں صدی کے اس آخری عشرے میں جبکہ نسلِ انسانی ایک نئے میلے نیئم (Millennium) جس کا ترجمہ ہم 'ہزارہ' کر سکتے ہیں داخل ہونے کی تیاری کر رہی ہے تو بہت سے مسئلے ہیں جو مستقبل کی شاندار توقعات کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اگر ان کے حل کو مناسب اہمیت نہ دی گئی گو ساتھ ہی ہمت افزا امکانات بھی ہیں جو ان خوابوں کو حقیقت بنانے میں مدد دے سکتے ہیں جو پچھلے دو سو سال کی چھ نسلوں کے دانشور دیکھتے چلے آئے ہیں۔ پرانی دنیا مستقبل میں جنت ارضی کے قیام کو اپنے محدود عقائد کے دائرے میں رکھ کر دیکھنے کی عادی تھی لیکن آج کی نسلیں مستقبل کے شاندار امکانات کو پوری نسلِ انسانی کے باہم اشتراک کے وسیع تناظر میں رکھ کر سوچنے کی کوشش کرنے لگی ہے جو نسلی، نظریاتی یا عقیدتی خانے بنانے کے بجائے ایک وسیع روحانی فکر ہے جس کے تقاضے تنگ نظری اور عصبیت کے دائروں کو توڑ چکے ہیں۔

یہ انسان گیر نقطۂ نظر اکیسویں صدی میں ممکن طور پر شریف انسانی معاشرہ قائم کرنے کی اساس بنے گا لیکن اس آئیڈیل تک پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نسلِ انسانی کے تاریخی اور تہذیبی سرمائے سے ان مثالوں کیلئے انسانی شعور مضبوط بنایا جائے جو بنیادی، تہذیبی قدروں پر مشتمل ہیں۔ کربلا ان مثالوں میں سب سے زیادہ اعلیٰ اور ہمہ جہتی مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ گہرے اور پاکیزہ انسانی جذبات کے تاروں کو پوری شدت کے

ساتھ متحرک کردینے والے اس المیے میں وہ اساسی تناظر میں حیرت انگیز پیروکاری کے ساتھ سموئی ہوئی ملتی ہیں جو جدا جدا تہذیبی بر اعظموں کو ایک ہی تار میں پرو دیتی ہیں۔ اکیسویں صدی انسانی جذبات کی تسکین کے لیے مآلِ کار تین المیوں کو سامنے رکھے گی۔ جن کے ہیرو — سقراط، عیسیٰؑ ابنِ مریم اور حسینؑ ابنِ علیؑ ہیں اور جو علامت ہیں ان اقدار کی جن کی اساس پر ایک پاکیزہ تر معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ لیکن حسینؑ ابنِ علیؑ کی کربلا ایک ایسی بھرپور علامت ہے کہ اس میں سابقہ دونوں المیوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے جو اس واقعے کو یا متعدد واقعات کے سلسلوں پر مشتمل اس المیے کو تاریخ کا سب سے نادر المیہ بنانے کا سبب ہوئے ہیں۔ کربلا ایک ہمہ جہتی علامت ہے جو تہذیبی قدروں کے نادر رشتوں پر مشتمل ہے اور اس لئے جدید عہد کے لئے وہی سب سے محترم علامت کا کردار انجام دے گی۔ امام حسینؑ نے شرفائے نسل انسانی کے دلوں میں جو گہرے احساساتِ محبت اور عقیدت پیدا کئے ہیں، پوری تاریخِ بنی آدم میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ انہوں نے پہلی بار مظلومیت کو ایک مقدس، ایک محترم اصول کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ قرآن مجید نے بڑی اساسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ انسان ہمیشہ سے ہمیشہ تک خسارے میں رہے گا۔ انسان کی یہی وہ بدقسمتی ہے جو اسے مظلومیت کے کسی نہ کسی دائرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہر شخص کی مصیبت، کربلا کے مصائب کے پیچ در پیچ کامپلکس (Complex) میں کہیں نہ کہیں اپنی شباہت ڈھونڈ لیتی ہے جو آفت کے ماروں کے لئے سکون کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

آج جدید عہد ایک سنگین بحران سے دوچار ہے۔ ایک طرف پچھلے چند عشروں میں عموماً اور گزشتہ عشرے میں خصوصاً سائنسی فکر کے کئی اساسی ستون ٹوٹ کر گر گئے ہیں اور دوسری طرف ساری مہذب دنیا اخلاقی اقدار کی بنیادیں تہذیبی قدروں کی اضافیت میں

ڈھونڈتی ہے۔ اضافیت کے اس تصور نے قوانین کے نظام کو لرزا کر رکھ دیا ہے اور پھر دولت کی فراوانی نے قوانین کو نظر انداز کرنے کے وسیع تر رجحان کو جنم دیا ہے۔ اس صورتِ حال نے ژان پال سارتر (Jean Paul Sartre) کو اتنا پریشان کیا کہ انہیں پیرس کے پروفیسرز کو جمع کر کے یہ سوال اٹھانا پڑا کہ معاشرے کو بچانے کے لئے کیا کیا جائے۔ جب ساری تہذیبی قدریں اضافی ہیں تو پھر لوگوں کو ان قدروں کے توڑنے سے کیسے روکا جاسکے گا۔

سارتر نے کہا اس صورت حال سے بچنے کی صرف یہ صورت رہ گئی ہے کہ کسی یقینی اور حتمی قدر کی اساس ڈھونڈی جائے۔ ایک حل سارتر کے خیال میں یہ تھا کہ خدا کے مفروضے کو زندہ کیا جائے لیکن سارتر کی رائے تھی — یہ مفروضہ بڑا مہنگا مفروضہ ہے۔ مہنگے کا مطلب یہ کہ — خدا کے نام پر انسانوں نے بڑا خون خرابہ کیا ہے لہٰذا کوئی حتمی و یقینی اساس ڈھونڈی جائے۔ لیکن سارتر نے جس بات پر توجہ نہ کی، وہ یہ تھی کہ ہر وہ اساس جو حتمی اور قطعی قرار دی جائے صرف منطقی، حتمی اور یقینی ہونے کی بنا پر ازلی و ابدی بھی تو ہو جائے گی اور ازلی و ابدی ہونے کی وجہ سے ہر سمت سے لامحدود بھی قرار پائے گی (ملاحظہ ہو تاریخ و کائنات — میرا نظریہ — از سید محمد تقی) لہٰذا خدا کا وہ مفروضہ جو ایک محدود، تصور ہی کے نتیجے میں تاریخ میں اتنا مہنگا تھا بلاشبہ پھر سے واپس تو نہیں آئے گا مگر خدا کے اس لامحدود تصور کی شکل میں تو بہر حال واپس لانا ہی پڑے گا۔

تو نسلِ انسانی ایک شدید اخلاقیاتی بحران سے دوچار ہے۔ اس اخلاقی بحران سے مقابلہ اکیسویں صدی کے انسان کو کرنا ہوگا اور اس کا حل بھی ڈھونڈنا ہوگا۔ جدید عہد صرف ایک سنگین سماجی بحران ہی سے دوچار نہیں ہے بلکہ زیادہ گہرائی میں اتر کر جائزہ لیا جائے تو بات فکری رجحان کی نظر آئے گی۔ جس کی وجہ سے بنیادی تہذیبی اقدار تنازعہ بن گئی ہیں۔ ہر چند اساسی تہذیبی اقدار کی اضافیت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ قدیم معاشروں میں بھی

اخلاقی قدروں کو کئی طاقتور حریف مل چکے ہیں۔ جو یونان کے سوفسطائیوں کی زبان میں بنیادی قدروں کی اضافیت کے حق میں مضبوط دلائل پیش کرتے رہے ہیں۔ افلاطون کے مکالمات میں ان کے استدلال کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سی سماجی اور معاشرتی قدروں کے اضافی ہونے کو تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ عدل اور ظلم — کی دو متضاد قدروں کے اساسی نہ ہونے کے حق میں کوئی مضبوط دلیل پیش کرنے کے حق میں ابھی تک کامیابی حاصل نہیں کی جاسکی۔ کسی چیز کو اس کی صحیح جگہ رکھنا ایک ایسا اصول ہے جسے وہ سب لوگ مان لیں گے جو منفی اندازِ نظر کو دلیل کے بغیر چھوڑنے پر تیار ہوں۔ اکیسویں صدی میں اس نازک تہذیبی صورتِ حال سے جدید عہد کو نمٹنا ہوگا لیکن فلسفیانہ اور عوامی سطح دونوں پر اس سے عہدہ برآ ہونے میں اکیسویں صدی کے سوچنے والوں کو بڑی مشکلات درپیش ہوں گی۔

اس صورتِ حال کا حل انسان کے تہذیبی سرمائے کے مختلف ثقافتی ورثوں میں موجود ہے۔ مختلف قدیم تہذیبوں، خاص طور پر، پراچینی ہندوستان اور چین کے فکری ادب بالخصوص یونانی فلسفے اور عہدِ جدید کی فکری سرگرمیاں نیز مذہبی قائدین کی اخلاقی سرگرمیوں اور ان مساعی کے دوران جو حیرت انگیز قربانیاں دی گئیں ان کے مجموعے میں بہت کچھ مل جائے گا۔ لیکن مجموعی طور پر پیغمبرِ اسلام اور ان کے اہلِ بیتؑ اور قرآن نے جو تہذیبی سنتھیسیس (Synthesis) نیا ثقافتی مرکب دیا ہے وہ ترقی یافتہ، آزاد اور مطمئن معاشرہ بنانے کی واحد مضبوط اساس بن سکتا ہے۔ اس ثقافتی مرکبے کے مرکزی مقامات، عراق اور ایران کے حوزہ ہائے علمیہ ہیں بلکہ عراق کے حوزہ ہائے علمی کے بارے میں اب کچھ کہنا مشکل ہے۔ وہاں تو حال ہی میں قیامت صغریٰ گزری ہے۔ ہاں ایران ابھی تک محفوظ ہے اور اس کے حوزہ ہائے علمیہ تاریخ کے عظیم فکری سرمائے کے مراکز کے طور پر اپنے فرائض

انجام دے رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نے ایران کو اس مقصد کے لئے چن لیا ہے کہ وہ اکیسویں صدی سے نسلِ انسانی کی قیادت کرے پھر اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جدید عہد اور اس کے مستقبل کو ایک خوبصورت معاشرے کے لئے جس آئیڈیل کی ضرورت ہے اس کے لئے صرف کربلا کا المیہ سلسلہ ہی نسلِ انسانی کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ کربلا آفاقی اطلاق رکھتی ہے۔ اس عظیم تر آئیڈیل کے سائے میں ایک حسینؑ ثقافتی نمونے نے جنم لیا ہے۔

مسئلوں کو ان کے گہرے مضمرات میں رکھ کر پرکھا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ کربلا ان خانہ بندیوں سے بلند تر ہے جن میں انسان نے اپنے آپ کو بانٹ رکھا ہے۔ اس لئے وہ لوگ اس ثقافتی آئیڈیل کی چمک اور حُسن کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جن کے شعور کی پختگی کے عمل میں کسی انسان گیر آئیڈیل سے کبھی وابستگی رہی ہو۔ یونان کے المیہ ڈراموں کا اختتامیہ عموماً ایک لابدیت پر ختم ہوتا ہے جس میں جبریت کا عنصر نمایاں ہے لیکن کربلا کا المیہ زیادہ صحیح ہوگا یہ کہنا کہ کربلا کا المیہ سلسلہ جس میں المیہ کہانیوں کے سلسلے موجود ہیں۔ درجنوں حقیقی المیوں پر مشتمل ہیں اور ہر قدم پر شعوری فیصلوں سے وجود میں آتے ہیں۔ یہ المیہ سلسلہ شعور کی حیرت انگیز پختگی کے نمائندہ ہیں جو اعلیٰ تہذیبی اقدار کی اساس پر کئے گئے فیصلوں میں نمایاں ہوئی ہے۔

یونان کا المیہ چند کرداروں پر مشتمل ہوتا ہے اور ڈرامہ نگار کی بلند پروازی کی نمائندگی کرتا ہے لیکن کربلا کا المیہ جو المیوں کے طویل سلسلوں پر مشتمل ہے حقیقی زندگی کے کرداروں کے ان شعوری فیصلوں کا مجموعہ ہے جو ایک ثقافتی نمونے کے سب سے بہتر آئیڈیل کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنے۔ یوں تو کربلا چند مہینوں یا دو تین برسوں پر پھیلے ہوئے واقعات کا مجموعہ ہے جبکہ اپنے جوہر میں یہ بجائے خود ایک تاریخ ہے جو تہذیب کے

سفر کے ساتھ چلی ہے۔ اس کا طویل پس منظر اور اس سے زیادہ طویل تر پیش منظر ہے۔ تاریخ کے آغاز کے ساتھ ان تہذیبی قدروں کے تحفظ کی جنگ شروع ہوئی تھی جو اپنے عروج اور کمال کے نقطے پر اکسٹھ (61) ہجری کے ابتدائی دس دن میں پہنچی اور پھر ایک دوسرے روپ میں ایک سال سے زیادہ مدت تک کوفے اور دمشق کے درباروں اور بازاروں میں لڑی جاتی رہی۔ پھر اس کے بعد اسلام کی تاریخ میں پیوست ہو کر آج تک جاری ہے۔ بیسویں صدی میں سنگین انسانی مشکلات کے باوجود نسلِ انسانی میں ہیومنزم (Humanism) بشریت نوازی کا تصور طاقتور ہو گیا اور اب اس تحریک کو کربلا کی عظیم علامتوں کے جلو میں تہذیب کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کی ایسی جنگ کو لڑنا۔

حوادثِ کربلا میں جذبات کی تطہیر کی جو قوت پائی جاتی ہے ارسطو نے اسے کتھارسس (Catharsis) سے تعبیر کیا ہے۔ عہدِ جدید کو جس سماجی خاکے یا ماڈل کو وجود میں لانا ہے وہ اسی تطہیری عمل سے پیدا ہو گا اور واضح طور پر اس کا انسان گیر اطلاق ہو گا۔ جذبات کی یہ تطہیر انسان کو مصنوعی قانون میں بانٹ کر ممکن نہ ہو گی نہ یہ اس آئیڈیل سے ہم آہنگ ہو گی جس کی کربلا نمائندگی کرتی ہے۔ کربلا کے واقعے پر جو آنسو بہائے جاتے ہیں وہ اکابر کی قربانیوں کی خدمت میں خراجِ عقیدت کی حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے انسانیت کے مظلوموں کے حقوق کے لئے قربانیاں دیں۔ چاہے وہ مہاتما گوتم بدھ ہوں جن کو زہر دیا گیا یا تبت کا وہ عظیم لامہ جس نے اپنی بیوی کی ہوسِ زر کی تسکین کے لئے زہر کھایا تھا۔ زردشت نے ان تمام پاکیزہ روحوں کو سلام کیا تھا جنہوں نے ماضی میں یا حال میں اصولوں کی بلندی کے لئے جنگ کی اور مظلوموں کو تحفظ دیا اور جو مستقبل میں اسی مشن کو جاری رکھیں گے۔ قدرتاً یہ سلام کربلا والوں تک پہنچ گیا۔

اصولوں کے لئے قربانی کہاں اور کن حالات میں دی جائے جبکہ عبداللہ ابن زبیر کا ذہن اس سطح پر عمل کر رہا تھا کہ یزید کے خلاف جو بغاوت کی جائے اس کے لئے موزوں تر جگہ کون سی رہے گی۔ امام حسینؑ مکے میں بے حد مقبول تھے۔ عوام کی رجوعات ان کی طرف تھی۔ عبداللہ ابن زبیر ان حالات کو دیکھ رہے تھے وہ خود بھی امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ ابن زبیر سیاسی بساط کے بڑے اچھے شاطر تھے۔ چاہتے وہ یہ تھے کہ امام حسینؑ کی اس مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر مکے کو یزید کے خلاف انقلاب و بغاوت کا گڑھ بنا دیں۔ اس لئے انہوں نے پوری سعی کی کہ مکہ سے ہجرت نہ کریں۔ ان کے ساتھ بھی مشکل یہ تھی کہ وہ اس سطح پر آپریٹ (operate) نہیں کر رہے تھے جہاں امام حسینؑ کی سوچ تھی۔ وہ حکمران کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے تھے اور اس جنگ کو ہر خانے میں لڑنے کو تیار تھے۔ اقتدار کی جنگ اخلاقی اقدار کی حدود میں نہیں صرف ان کی لاشوں پر لڑی جاتی ہے۔

عبداللہ ابن زبیر یزید سے اقتدار کی جنگ لڑ رہے تھے اور اس لئے مکے یا کعبے کی حرمت اور تقدس کا مسئلہ ان کے سامنے نہ تھا۔ انہیں اپنی اس جنگ کیلئے موزوں جگہ کی تلاش تھی اور ظاہر ہے مکے سے زیادہ کوئی اور موزوں جگہ اس کام کیلئے نہ ہو سکتی تھی کہ مکہ عالمِ اسلام کا دل اور سیاسی اعتبار سے وہ اہم جگہ تھی جہاں سے حجاج کے ذریعے اپنے پیغام کو سارے عالمِ اسلام تک پہنچانا ممکن تھا۔

جناب عبداللہ ابن زبیر نے مدینے میں یزید کی بیعت کے سلسلے میں گورنر مدینہ کی ملاقات کی دعوت کو بھی درخورِ اعتنا خیال نہ کیا اور گورنر سے ملاقات کئے بغیر مدینے سے چلے گئے تھے۔

امام حسینؑ اور عبداللہ ابن زبیر تقریباً یکساں صورتِ حال میں تھے۔ لیکن دونوں

کے انداز و عمل اور (Behaviour) میں فرق ہے۔ یزید نے دونوں سے مطالبہ بیعت کیا اور دونوں ہی نے بیعت سے انکار کر دیا۔ امام حسینؑ کی طرح عبداللہ ابن زبیر بھی مکے چلے گئے۔ لیکن ان مشابہ حالات کے باوجود انداز و عمل میں فرق رہا۔ امامؑ نے گورنر مدینہ کی دعوت قبول کی، اور دارالامارہ تشریف لے گئے۔ ادھر امامؑ مکے کے قیام کے دوران محض خاموش زندگی بسر کرتے رہے مگر عبداللہ ابن زبیر کافی فعال رہے اس لئے کہ ان کے مقاصد مختلف تھے۔ امام حسینؑ دمشق کی حکومت ڈی فیکٹو تسلیم کرتے تھے ڈی جوری نہیں۔ بالفاظِ دیگر امام حسینؑ کے خیال اور تجزیے میں مسلم معاشرہ اموی آمریت کو اکھاڑ پھینکنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے انقلاب و بغاوت دل خوش کن نعرہ تو تھا ہوشمندانہ نہیں لہٰذا اسے ڈی فیکٹو تسلیم کرنا صحیح راستہ تھا لیکن ڈی جوری تسلیم کرنا کسی حال میں ممکن نہ تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ یہ مان لیا جائے کہ یزید کی حکومت جائز حکومت ہے۔ لہٰذا امام حسینؑ آمر سے حتی الامکان ڈائریکٹ کنفرنٹیشن سے بچتے رہے یعنی یوں کہیے کہ انہوں نے اپنی طرف سے کوئی ایسا قدم اٹھانے سے آخر وقت تک احتراز برتا جو براہِ راست تصادم کیلئے عذر بن جاتا۔

عبداللہ ابن زبیر کا طرزِ عمل اس سے مختلف تھا اس لئے کہ وہ مدعی خلافت تھے چنانچہ آگے چل کر انہوں نے دعویٰ خلافت کیا بھی لہٰذا ڈائریکٹ کنفرنٹیشن سے بچنے کی نازک تر اخلاقی ذمہ داری کا خیال بھی انہیں کسی مرحلے پر نہ آیا۔ علاوہ بریں وہ امامؑ سے مختلف سن سبلیٹی (حسیت) رکھتے تھے۔ واضح طور پر وہ اقتدار کی جنگ میں مصروف تھے۔ اس لئے ان کی اخلاقی حسیت (Moral sensibility) بھی یکسر مختلف سطح کی تھی۔ مکے میں ان کا قیام کسی مستقبل کی تیاری کے لئے تھا۔ وہ مکے کی جائے پناہ کو اپنی آئندہ جنگ کے

لئے مہلت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جبکہ حسینؑ واقعی صرف جائے پناہ کی تلاش میں مکے تشریف لے گئے تھے۔ امامؑ اقتدار کی جنگ میں مشغول ہوتے تو مکے کے بجائے سیدھے کوفے روانہ ہو جاتے، جہاں ان کے حامیوں کی کثیر تعداد انقلاب کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ امامؑ کے لئے بغاوت کا بہترین میدان کوفہ تھا، مکہ نہیں جبکہ عبداللہ ابن زبیر کے لئے مکہ بغاوت کے لئے نہایت موزوں تھا اس لئے کہ ان سے کسی خاص علاقے کے باشندوں کو کوئی براہِ راست وابستگی نہ تھی لہٰذا مکے کی اہمیت ان کے مقاصد میں ممد ثابت ہوسکتی تھی جبکہ عراق کا امامؑ سے گہرا تعلق تھا جو ان کے باپ اور بھائی کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ لہٰذا جنگِ اقتدار پیش نظر ہوتی تو امام الٹے بانس پہاڑوں پر کے مصداق عراق سے مزید دور ہونے مدینے سے جنوب کی طرف مکے نہ جاتے بلکہ مدینے کے شمال مشرق کی طرف سیدھے کوفے چلے جاتے، مگر مدعا اقتدار تھا ہی نہیں اس لئے جائے پناہ کے لئے مکے سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔

پھر قیام مکہ کی سرگرمیوں کا آپ جائزہ لیں تو بھی اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ امامؑ کا مقصودِ نظر کچھ اور تھا۔ 3 شعبان 60ھ سے لے کر 10 رمضان 60ھ تک یعنی پانچ ہفتوں کی مدت میں امامؑ کی طرف سے کوئی خط اہلِ کوفہ کو انقلاب برپا کرنے کی ہدایت یا فہمائش سے متعلق نہیں بھیجا گیا۔ امامؑ نے کسی کو کوئی خط نہیں لکھا۔ خط لکھے تو اہل کوفہ نے، چنانچہ پہلا خط 10 رمضان کو امامؑ تک پہنچا۔

واضح طور پر اقتدار کی جنگ لڑنا مقصود ہوتا تو امام درجنوں خطوط متواتر کوفے اور دوسرے مقامات کو بھیج چکے ہوتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لئے کہ مقصود تھا ہی کچھ اور، جنگ اقتدار نہ تھی۔

امام حسینؑ کا تجزیہ

امام حسینؑ نے یہ تجزیہ کیا تھا کہ مسلم معاشرہ دمشقی آمریت اکھاڑ پھینکنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ دمشق کی حکومت ظالم اور جابر حکومت تھی اس جابر حکومت کے خلاف انقلاب و بغاوت کی کال دینا بالکل جائز تھا لیکن یہ بغاوت کامیاب ہونے والی نہ تھی اس لئے کہ حالات سازگار نہ تھے۔ دمشق کی حکومت کو ڈی فیکٹو تسلیم کرنے کی وجہ یہی تھی کہ — وہ انصرام وانتظام پر پوری طرح قابض تھی اس لئے ہوشمندی اور عملی سوجھ بوجھ کا تقاضا یہ تھا کہ اسے عملی حقیقت کے بطور تسلیم کرلیا جائے۔ صورتِ حال کے بارے میں امامؑ کا تجزیہ کس قدر صحیح تھا اس کا اندازہ اس تجربے کی ناکامی سے لگایئے جو عبداللہ ابن زبیر نے کیا۔ عبداللہ ابن زبیر نے یزیدی حکومت کے خلاف اس وقت انقلاب و بغاوت کی کال دی جب یزید واقعہ کربلا اور مدینے کے قتل و غارت گری کا ذمہ دار قرار پا چکا تھا اور اس کے خلاف رائے عامہ میں کافی ہیجان برپا ہو چکا تھا تاہم ان کی بغاوت بُری طرح ناکام ہوئی اور ساتھ ہی کعبے کی سنگین بے حرمتی بھی ہوئی یعنی حد ہے منجنیق لگا کر کعبے کو مسمار کر کے آگ لگا دی گئی۔ امامؑ کی مستقبل بین نظریں جو حقائق کے صحیح تر تجزیے کی روشنی میں جائزہ لے رہی تھیں اس صورتِ حال کو پہلے سے دیکھ چکی تھیں جن کا امام حسینؑ نے بار بار واضح طور پر اظہار بھی کر دیا تھا۔

کعبے کو آگ لگانے کا واقعہ 3 ربیع الاول 64ھ کو پیش آیا اور 14 ربیع الاول کو یعنی صرف گیارہ دن بعد یزید کا انتقال ہو گیا۔ مدینے کی قتل و غارت گری کا واقعہ 28 ذی الحجہ 63ھ کا ہے یعنی واقعہ کربلا سے دو سال بعد جبکہ مکے پر حملہ کا حادثہ کوئی سوا دو سال بعد رونما ہوا۔ اس وقفے کے بعد سانحہ کربلا نے عوام میں کافی ہیجان برپا کر دیا تھا تاہم دمشق کی

حکومت اتنی مضبوط تھی کہ عبداللہ ابن زبیر کی انقلابی سعی پھر بھی کامیاب نہ ہوسکی۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت جب امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا تھا اور یزید نیا نیا حکمران بنا تھا حالات کس قدر مختلف ہوں گے۔ یزیدی حکومت پر نہ کربلا کے حادثے کی ذمہ داری پڑی تھی نہ مدینے کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی۔ اس لئے اس وقت حالات بہت زیادہ نارمل تھے۔ ایسے حالات میں انقلاب و بغاوت کی کال دینا ہوشمندانہ اقدام کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس وقت تو واحد دانشمندانہ اقدام وہی تھا جو امام حسینؑ نے کیا یعنی حکومت کے خلافِ براہ راست تصادم مول لئے بغیر ایک پُر امن شہری کے حقِ اختلاف کا تحفظ کرتے رہے اور حکومت کے پورے دباؤ کے باوجود ان مجرمانہ نظریوں کی توثیق نہ کی جو حکومت پیش کررہی تھی اور جن کی وہ مدعی تھی۔

اصولوں کی جنگ کی اصطلاح اگر زیادہ عمومی انداز میں استعمال کی جاسکے اور اصولوں کی جنگ کو مثبت اور منفی اصولوں، دونوں کی جنگ قرار دیا جاسکے تو کہا جاسکتا ہے کہ یزید بھی امام حسینؑ سے اصولوں کی جنگ لڑ رہا تھا یعنی یوں کہیے کہ کربلا کی جنگ امام حسینؑ کی طرف سے بھی اور یزید کی طرف سے بھی اصولوں کی جنگ تھی ایک طرف مثبت اصول تھے اور دوسری طرف منفی۔ یہ اقتدار کی جنگ کسی طرف سے نہ تھی۔ حسینؑ کسی کے اقتدار کیلئے خطرہ نہ تھے۔ انہوں نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو حکومت کے لئے موجب پریشانی بنتا لہٰذا یزید کو ان سے اقتدار کی جنگ لڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی البتہ عبداللہ ابن زبیر سے صاف اقتدار کی جنگ ہوئی۔ عبداللہ ابن زبیر نے نکل کر بغاوت کی۔ اعلانِ خلافت کیا جبکہ امام حسینؑ نے اس طرح کا کوئی اعلان نہیں کیا۔

یزید کو یہ معلوم ہونا چاہیے تھا اور اس کے باپ نے ایک وصیت کے ذریعے اسے

یہ بتا بھی دیا تھا کہ عبداللہ ابن زبیر حکومت کیلئے خطرہ بن سکتے ہیں، تاہم یزید نے انہیں درخورِ اعتنا خیال نہ کیا اور سارا زور ایک ایسے شخص کے خلاف لگا دیا جو کسی طرح بھی حکومت کے لئے خطرہ نہ تھا۔ واضح طور پر اس لئے کہ یزید ان اصولوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا جن کی نمائندگی امام حسینؑ کرتے تھے اور جن سے یزید کو چڑ تھی۔ یزید دوسرے تصورات اور نظریات کا حامل تھا جو امام حسینؑ کے اصولوں کی ضد تھے۔ تو یوں کربلا دمشق کی طرف سے بھی اور امام حسینؑ کی طرف سے بھی اصولوں کی جنگ تھی اسے اقتدار کی جنگ قرار دینا صحیح نہ ہوگا جبکہ مدینے کی بربادی اور غارت گری بھی واضح طور پر اصول کی جنگ نہ تھی ورنہ مدینے والوں نے کونسا اعلانِ بغاوت کیا تھا جو یزید ان پر چڑھ دوڑا۔ مدینے کا حادثہ کیوں رونما ہوا۔ اسی لئے تو نا کہ یزید کے قاصد نے سارے شہر میں ڈونڈی پٹوا دی کہ حسینؑ کربلا میں شہید کر دیئے گئے۔ اس اعلان کی کیا ضرورت تھی۔ حکمران ہمیشہ عوامی رجحان کو پیدا ہونے سے روکنے کی بھرپور سعی کیا کرتے ہیں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ خود حکومت عوامی ہیجان بھڑکانے کے لئے اقدام کرے۔ اقتدار کے تحفظ کا تقاضا یہ ہے کہ عوام کو حکومت کی غلط کاریوں سے بے خبر رکھا جائے نہ یہ کہ عوام کو ایک انتہائی حساس واقعے کی خبر دے کر بغاوت کیلئے اکسایا جائے مدینے کی بغاوت واضح طور پر یزید نے خود کرائی، نہ وہ اہل مدینہ کو واقعۂ کربلا کی اطلاع دیتا نہ یہ بغاوت رونما ہوتی لیکن یزید نے یہ سب کچھ کیا، اور نتائج کو پوری طرح جان کر، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یزید بغاوت کا خطرہ اپنے اقتدار کے متزلزل ہونے کا خطرہ مول لے سکتا تھا مگر اس نفرت و حقارت کو نہ دبا سکتا تھا جو اسے ان اصولوں سے تھی جن کی قیادت حسینؑ کر رہے تھے۔

علامتیں

مدینے میں جو کچھ ہوا وہ ٹھیک وہی تھا جو کربلا کے باب میں کیا جا چکا تھا۔ خواہ مخواہ امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کر کے یزید نے واقعہ کربلا برپا کرایا اور خواہ مخواہ واقعہ کربلا کی اطلاع کا مدینے میں ڈھنڈورا پیٹ کر حادثہ مدینے کے انعقاد کا بانی بنا۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یزید کو آنحضرتؐ اور اسلام سے جو چڑ تھی اس کا مظاہرہ اس طرزِ عمل سے ہوا جو یزید نے اسلام کی تین واضح علامتوں حسینؑ — مدینے اور مکے کے باب میں اختیار کیا۔ رسولؐ کے خاندان کو تباہ و برباد اور مدینے کو تہس نہس کر ڈالا۔ مکے کے ساتھ بدسلوکی میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ اس محترم اسلامی علامت کی المناک ترین بے حرمتی کی گئی یہ سب کچھ اقتدار کی جنگ کے تقاضے نہ تھے۔ یہ انتقامی جذبے کی آگ تھی جو یزید کے سینے میں بھڑک رہی تھی اور جسے اس نے ان تینوں اہم ترین اسلامی علامتوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ کر ٹھنڈا کیا۔

بہر حال عبداللہ ابن زبیر اور امام حسینؑ کے طرزِ عمل (Behaviour) انداز اور طرز میں جو واضح فرق پایا جاتا ہے۔ ان سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ اقتدار کی جنگ اور اصولی و نظریاتی تصادم میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

امام حسینؑ نے کہیں اور کبھی دعویٰ خلافت یعنی تختِ دمشق پر قبضے کے مقصد کا اعلان نہیں کیا، انہوں نے صرف بیعت سے انکار کا اعلان کیا اور وہ بھی مطالبہ بیعت کے بعد اس سے پہلے نہیں جبکہ عبداللہ ابن زبیر نے کھل کر اعلانِ خلافت کیا اور یزید کی حکومت کے خلاف بغاوت کی کال دی۔ یقیناً یزید کے جبر و ظلم کے پیش نظر انہیں عوام کی بغاوت پر آمادہ کرنے کا پورا حق حاصل تھا۔ مدعا اقتدار تھا لیکن اقتدار کا حصول بجائے خود تو کوئی بری

چیز نہیں۔ برائی تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اقتدار کو جبر و ظلم کے لئے استعمال کیا جائے لیکن یہ امر کہ ان کی جنگ اقتدار کی جنگ تھی، بہرحال واضح ہے اور اس لئے ان کے اور امام حسینؑ کے طرزِ عمل میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ عبداللہ ابن زبیر کی اپنی خواہش کیا تھی اس سے قطع نظر یہ واقعہ ہے کہ جو شخص واقعہ کربلا کا مجرم اور ہتکِ مدینہ کا جرم کر چکا ہو اس کے خلاف اعلانِ بغاوت بالکل جائز تھا لیکن یاد رہے امام حسینؑ کے سامنے یہ صورتِ حال نہ تھی۔ امام حسینؑ سے بیعت سے انکار کے وقت حسینؑ کو شہید کرنے والے اور مدینے میں قتل و غارت گری کرانے والے مجرم کی بیعت سے انکار نہیں کر رہے تھے۔ اس لئے امام حسینؑ کا طرزِ عمل قدرتاً مختلف سمت میں آگے بڑھا۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عبداللہ ابن زبیر کی طرح کیوں امام حسینؑ نے بھی نکل کر یزید کے خلاف کال نہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یزید جیسے ظالم کے خلاف عبداللہ ابن زبیر کی کال پسندیدہ تو تھی مگر ہوشمندانہ نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے اس لئے کہ ایک تو وہ عملاً نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی اور دوسرے اس کے نتیجے میں حرمتِ کعبہ بھی ضائع ہوئی۔ امامؑ نے اس امکانی خطرے کے پیشِ نظر مکے سے قصدِ سفر کیا تھا تاکہ ان کے کسی اقدام سے وہ کتنا ہی جائز کیوں نہ ہو مکہ کے تقدس پر ضرب نہ پڑے۔ اب یہ تو بہرحال کہا ہی جا سکتا ہے کہ عبداللہ ابن زبیر نے مدینے کے سانحے کے بعد بھی مکے کو حملہ آوروں کی آماجگاہ بنانے کا موقع فراہم کر کے کچھ زیادہ ذمہ دارانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ بات البتہ کہی جا سکتی ہے کہ:

جناب عبداللہ ابن زبیر پر یزید کے خلاف اعلانِ جنگ واجب ہو گیا تھا اس لئے کہ وہ امامؑ کے قاتل اور مدینے کو تباہ کرنے کا ذمہ دار بن چکا تھا۔ تاہم اس بغاوت کے لئے خود مکے کو بطور مرکز کے چنا جانا اخلاقی و مذہبی طور پر اس کا کوئی ہوشمندانہ جواز نہ تھا۔ ہاں

سیاسی اور فوجی اعتبار سے یہ اقدام البتہ موزوں قرار دیا جاسکتا تھا۔ تو امام حسینؑ اور عبداللہ ابن زبیر کے طرز عمل میں فرق ایک تو بنیادی شخصیتوں کے اختلاف کا فرق تھا اس لئے کہ دونوں کے کردار نظریات اور مقاصد مختلف تھے۔ دوسرے حالات کا فرق بھی تھا۔ عملی سیاسی تقاضوں کے پیش نظر عبداللہ ابن زبیر کے اقدام کے وقت حالات زیادہ سازگار تھے۔

سانحۂ کربلا رونما ہو چکا تھا اور اس کا دھماکہ اِدھر اُدھر سنا جا رہا تھا۔ خود مدینے میں عوام علمِ بغاوت اٹھا کر میدان میں آچکے تھے جس کے نتیجے میں مدینہ تاریخ کے المناک ترین قتل عام اور غارت گری کا مرکز بن چکا تھا۔ جس سے عوامی ہیجان میں کافی شدت پیدا ہو گئی تھی اس لئے عبداللہ ابن زبیر کا منصوبہ اور مقصد کچھ بھی کیوں نہ ہو نئے سازگار حالات ضرور ان کے ساتھ تھے لہٰذا انقلاب و بغاوت کی طرف بلانے میں انہیں زیادہ ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوئی۔ پھر اخلاقی اور مذہبی اعتبار سے یزید دو سنگین ترین جرائم کا مرتکب بن چکا تھا یعنی قتل حسینؑ اور ہتکِ مدینہ، لیکن امام حسینؑ کے اعلانِ انکارِ بیعت کے وقت یہ دونوں صورتیں موجود نہ تھیں۔ عوامی ہیجان بھی سطح پر پوری طرح نمایاں نہ ہوا تھا۔ اس لئے بھی امام حسینؑ جس محتاط سیاست پر چل رہے تھے اس کے پیشِ نظر انقلاب و بغاوت کی کال دینا مناسب نہ تھا۔ وہی پالیسی ہوشمندانہ اور اخلاقی اقدار کے مطابق تھی جس پر امام حسینؑ شروع سے آخر تک چلتے رہے۔

حکمران اور آرٹ

تاریخ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ حکمرانوں نے آرٹ کی شعوری طور پر خدمت کی ہے اور فنونِ لطیفہ کو ترقی دینے اور پھیلانے کے لئے اقدامات کئے ہیں لیکن ان

حکمرانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہوں نے فنون کو محض عیاشی کے لئے استعمال کیا ہے۔ حکمرانوں کا یہ طبقہ جس میں اموی حکمران نمایاں حیثیت رکھتے ہیں فنونِ لطیفہ کو پرورش دینے کا یہ اعزاز حاصل نہیں کر سکتے جیسا کہ بعض مستشرقین کا خیال ہے اڈے چلانے اور رقص و موسیقی یا مجسمہ تراشی کے اسکولوں کی سرپرستی کے درمیان جوہری فرق ہے ظالم و جابر حکمراں جو آرٹ کی اقسام کو اپنی وحشیانہ جسمانی عیاشی کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ دراصل سرکاری نگرانی میں غنڈہ گردی کے اڈے چلاتے ہیں۔ آرٹ کی خدمت نہیں کرتے۔ آرٹ روحانی وابستگی سے عبارت ہے۔ اس لئے آرٹ کی اقسام کئی مذاہب میں عبادات میں شامل کی گئی ہیں۔ غنا کو چند مستثنیٰ مثالوں کے علاوہ تمام مذاہب نے روحانی غذا کے طور پر استعمال کیا ہے، تاہم غناء کو غنڈہ گردی کے لئے بھی کافی بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے اس لئے یہ سمجھنا کہ ہر وہ شخص جو غنا، رقص یا مجسمہ تراشی سے دلچسپی لیتا ہے لازماً آرٹ کا خادم ہوگا۔ صحیح نہیں، اموی حکمران دو ایک مثالوں کے علاوہ ظالم جابر اور عیاش حکمران تھے، انہوں نے کسی مانی کسی بہزاد کسی بیتھووِن (Bethoven) کسی موزارٹ (Mozart) کسی مائیکل اینجلو (Michalangelo) کسی تان سین اور کسی امیر خسرو کی پرورش نہیں کی۔ وہ آرٹ کے پاکیزہ روحانی عنصر کو جو جذبات کی تہذیب اور روح کی طہارت کا فرض انجام دیتا ہے، اور جسے یونانی مفکرین نصاب تعلیم کا لازمی جز قرار دیتے تھے۔ سمجھنے سے محض محروم تھے۔ اس لئے ان پر آرٹ کی سرپرستی کا الزام لگانا محض ایک تہمت ہے۔ آرٹ جس جذباتی پاکیزگی کو پیدا کرتا ہے۔ اس سے قتل و غارت گری اور ظلم و عدوان سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے جذبات کی تہذیب کے معنی ہی یہ ہیں کہ جبر و ظلم سے طبیعت میں نفرت، کراہت ابھر آئے۔ سانحۂ کربلا — مدینے کی لوٹ مار اور مکے کو تاخت و تاراج کرنے والا یزید اور کوئی

والٹیئر ، تاریخ ادب بلکہ فکری ادب کی ایک محترم شخصیت تھا اور ان لوگوں میں سرخیل کی حیثیت رکھتا تھا جو عظیم انقلاب فرانس کے بانی اور مفکر کہے جاتے ہیں۔اپنے عہد کی مذہبی سوچ سے چڑتھی یعنی اس حد تک کہ لزبن کے زلزلے میں جب دس ہزار آدمی مر گئے تو اس نے چیخ کر کہا کہ اس واقعے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں اور اگر ہے تو رحمدل نہیں۔ والٹیئر نے تاریخ انسانی کا جائزہ لے کر کہا کہ تاریخ آج تک حسینؑ ابنِ علیؑ جیسی اثر انگیز شخصیت پیدا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ والٹیئر سے کچھ زیادہ ہی مذہب دشمن مصنف۔ گبن۔ تھا۔ جس کے بارے میں لیکی نے تاریخِ اخلاق یورپ میں لکھا کہ ایڈورڈ گن (Edward Gibbon) کو تو عیسائیت سے اس قدر چڑ ہے کہ صرف عیسائیت کا نام سن کر اس کے مرچیں لگ جاتی ہیں۔ کربلا کا ذکر کرتے ہوئے گبن لکھتے ہیں کربلا کا واقعہ کسی دور کے سنگدل سے سنگدل شخص کو بھی سنایا جائے تو اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں گی۔

یاد رہے گبن کی تاریخِ شہنشاہیت روما کا زوال و ہبوط ایک سو امہات کتب میں شامل خیال کی جاتی ہے جو تہذیبِ انسانی کی عظیم تصنیفات میں شامل ہیں۔

یوں تو حسینؑ کی بارگاہ میں بہت سے غیر مسلم دانشوروں نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے لیکن والٹیئر اور گبن کا اختصاص یہ ہے کہ انہیں منظم مذاہب سے کوئی تعلق نہ تھا جبکہ ضمناً یہ بات بھی ذکر کر دی جائے تو گبن کی سوچ کی صحیح نمائندگی ہوگی کہ اسے ہندوؤں سے نفرت بھی اس لئے تھی کہ وہ دوسروں سے کہیں زیادہ مذہبی ہوتے ہیں۔

ان دونوں کے خیالات کو سامنے رکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حسینؑ کا مسئلہ مذاہب کی حد بندیوں سے بلند ہے یعنی حسینؑ پوری تہذیبِ انسانی کا مشترکہ سرمایہ

سوا لاکھ انسانوں کا قاتل حجاج ابن یوسف، سب کچھ ہو سکتے ہیں، آرٹ اور فن کے حامی کبھی نہیں ہو سکتے۔ آرٹ نوازوں پر کمزور قلب ہونے کا الزم تو لگایا جا سکتا ہے جابر، ظالم اور وحشی ہونے کا الزام آج تک نہیں لگایا جا سکا۔ ہر جگہ دراصل افراط و تفریط کا مسئلہ سامنے آ جاتا ہے۔ اعتدال جسے ارسطو نے سلامتی کی راہ قرار دیا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر ایک عملی حقیقت کی طرح موجود رہتا ہے۔ آرٹ میں ضرورت سے زیادہ انغماس تہور و جرأت مندی کے لئے مضر ہے لیکن آرٹ سے دلچسپی میں زیادہ ہی تفریط، جذبات میں عبوست، خشونگی اور صلابت پیدا کر دیتی ہے جو زیادہ بڑھ جائے تو بربریت، غنڈہ گردی اور خون آشامی پر منتج ہوتی ہے۔ تاریخ عالم کے تمام جابرہ آرٹ سے طبعی بُعد رکھتے تھے اس لئے کہ ظلم پرستی، انسان دشمنی اور قتل و غارت گری سے دلچسپی اور فنون لطیفہ سے لگاؤ کسی سینے میں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ عیاشی کیلئے عالیشان محل بنانے اور کسی محبت کے اظہار کے لیے تاج محل تعمیر کرنے میں جوہری فرق ہے۔ ایک جگہ حسن و فنون سے محبت پھوٹتی ہے جبکہ شاندار محلوں کی مرعوب کن دیواروں میں خون کے دھبے مستتر دھبے موجود رہتے ہیں۔ اس لئے صرف شاندار محل بنا دینے کی وجہ سے، کسی حکمران کو فنون کا دلدادہ قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ یہ بات تاریخ کے ایک کلیے کے طور پر کہی جا سکتی ہے کہ تمام جابر حکمران صلابت زدہ جذبات کے مالک رہے ہیں جس کا اظہار فنون لطیفہ کے ساتھ عیاشی کرنے اور سسکتی لاشوں پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے دہشت انگیز عمل کے ذریعے بھی ہوتا ہے اور لاشوں کے مینار کھڑے کرنے اور سربریدہ لاشوں کی تشہیر کے ذریعے بھی۔ عقل کی تہذیب منطق کی تربیت سے اور جذبات کی طہارت فنونِ لطیفہ سے ہوتی ہے اور ان دونوں کا جبر و ظلم سے کبھی نباہ نہیں ہو سکا۔ یزید کے بیٹے معاویہ ابن یزید کی مثال سامنے ہے جو یونانی علم و فکر کا دلدادہ تھا۔ بیٹے نے باپ کے

تخت پر اس لئے ٹھوکر ماردی کہ اس تخت کے لئے کربلا پیش آئی تھی۔ معاویہ ابن یزید نے باپ اور دادا دونوں کی مذمت کی کہ انہوں نے حسینؑ اور ان کے باپ علی سے ناجائز جھگڑا کیا اور گناہوں کے جھرمٹ میں پھنس کر اپنی قبر تک جا پہنچے۔

تو یہ کہنا بہت بڑی زیادتی ہوگی کہ اموی حکمران (دو کے علاوہ) جو صرف ظلم و بربریت کے نقیب تھے آرٹ کے خادم تھے جبکہ آرٹ کی دلچسپی اور ظلم و جبر کے درمیان مزاج، کردار اور عمل میں یکسر بیر ہے کہ کبھی آرٹ سے دلچسپی بربریت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔

ردِ عمل

کربلا کے سانحہ ھائلہ نے تمام عالمِ اسلام کو لرزا دیا۔ کوفے اور دمشق میں جناب زینبؑ کی طاقتور خطابت نے آگ لگا دی۔ چنانچہ کوفے اور دمشق کے راستے میں کئی جگہ اس یزیدی فوج پر جو اہلِ بیتؑ کے قیدیوں کو لے کر دمشق جا رہی تھی۔ انقلابیوں نے شب خون مارے۔ پھر شام کی بیوروکریسی نے جو یہ افواہ اڑائی تھی کہ اسرائے اہل بیتؑ فی الاصل اسرائے ویلم ہیں یعنی غیر مسلم متحاربین کے اعزاء سو اس کا راز بھی جناب زینبؑ کی تقریروں کی وجہ سے فاش ہوگیا جس کے نتیجے میں رائے عامہ حکومت کے خلاف بھڑکنے لگی۔

اِدھر دمشق کی یہ صورت تھی اُدھر یزید نے سنگین ترین حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسرائے اہل بیتؑ کی کوفے میں موجودگی کے وقت بھی مدینے میں سانحۂ کربلا کی اطلاع اپنی زبردست فتح کے اعلان کے طور پر پہنچا دی جس نے مدینے میں سخت ہیجان برپا کردیا اور اہلِ مدینہ کے نمائندوں کے وفود صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے دمشق آنے

لگے۔ ہیجان انگیز صورت حال پر قابو پانے کیلئے شام کے حکمرانوں نے یہ مناسب سمجھا کہ امام زین العابدینؑ اور ان کے خاندان کو جلد از جلد اور احترام کے ساتھ مدینے واپس کر دیں تا کہ ابھرتی ہوئی بغاوت پر قابو پایا جاسکے۔ یزید صورتِ حال سے اتنا بوکھلا اٹھا کہ کہاں تو وہ کربلا کی مزعومہ کامیابی کی خوشی میں اشیاخِ بدر کو یاد کر رہا تھا اور کہاں اب یہ نوبت آ پہنچی کہ اس نے امام زین العابدینؑ کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ

''خدا ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر لعنت کرے، اگر براہ راست آپ
کے والد کا اور میرا سامنا ہو جاتا تو جو کچھ وہ فرماتے میں منظور کر لیتا،
اور کبھی قتل کرنا گوارا نہ کرتا۔''

اتنا ہی نہیں یزید نے یہ بھی کہا —

''اب آپ تشریف لے جائیے اور وہاں سے مجھے خط لکھتے رہیے بلکہ جو بھی ضرورت ہو اس سے مطلع کیجئے گا۔''

بدر کے اپنے مقتول اعزاء کا انتقام لینے پر کامیاب ہونے والے حکمران کے غرور و تبختر سے بھرے ہوئے اشعار پڑھیے اور اپنی عداوت کی آماجگاہ یعنی پیغمبر اسلامؐ کے ان اہلِ خاندانؑ کے حضور جن کی تذلیل و توہین میں دمشق نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ یہ خوشگوار لہجہ بھی دیکھئے: ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا یہ پاؤں تلے سے زمین نکل جانے کی بات تھی کہ یزید اس طرح گڑگڑا رہا تھا۔ ذرا توجہ سے دیکھئے، کیا یہ الہڑ اور عیاشی میں مبتلا رہنے والے نوجوان کے لچھن تھے یا ایک چالاک اور اقتدار کی جنگ سے واقفیت رکھنے والے سیاست دان کی چالاکی، یزید عیاش اور اوباش تو تھا ہی لیکن چالاک سیاست داں بھی تھا جو اقتدار کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق عمل بھی کر لیتا تھا۔

یوں تو چند مستثنیٰ مثالوں کے علاوہ تاریخ کے تمام حکمران عیاش اور ظالم ہوئے ہیں لیکن عیاشی میں ڈوب جانے والے حکمران نسبتاً کم ظالم ہوئے ہیں۔ بمقابلہ ان حکمرانوں کے جو اپنے ظلم کیلئے شہرت رکھتے ہیں۔ چنگیز ہلاکو اور ہٹلر زیادہ ظالم اور عیاش بہت کم تھے لیکن یزید عیاشی کے ساتھ ظلم میں بھی پیش پیش تھا۔ سانحہ کربلا واقعہ حرہ یعنی مدینے کی تباہی اور مکے کی بربادی کے حادثے اس کے بربریت آمیز مزاج و نہاد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ظالم حکمران عام طور پر چالاک اور عیاری کے فن میں بھی طاق ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ تاثر قائم کرنا جیسے یزید ایک بگڑا ہوا عیش پسند شہزادہ ہو جسے سیاسی بازیگری سے آگہی نہ ہو تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

سیاسی معاملات میں یزید نے جس بے تدبیری کا مظاہرہ کیا اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ سیاسی ضرورتوں سے واقفیت نہ رکھتا تھا۔ مشکل اس کے ساتھ یہ تھی کہ وہ آنحضرتؐ سے شدید اور گہری عداوت کے انتہائی مشتعل جذبے پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا اس لئے اس نے خاندانِ رسولؐ کے ساتھ انتہائی بے رحمانہ چالیں چلیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا مقصد ہی اس خانوادے کو تباہ کرنا قرار دے لیا تھا۔ اس لئے ان سیاسی نتائج کو بھلا بیٹھا جو اہلِ بیتؑ دشمن اقدامات کے منطقی نتیجے کے طور پر پیدا ہونے تھے۔ اس کی کچھ آنکھ کھلی تو صرف اسی وقت جب دمشق اور مدینے میں بغاوت کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ کوفے کی بغاوت سے وہ اتنا خائف نہ تھا لیکن عوامی رجحان جب دوسرے اہم مراکز میں پھیلنے لگا تو وہ ذرا سنبھلا، مگر انتقام تو وہ لے ہی چکا تھا۔ کربلا تو منعقد ہو ہی چکی تھی اور اس لئے اب اتنی سی رعایت برتنی کہ اسرائے اہل بیتؑ کو رہا کر دیا جائے کسی اہمیت کی حامل نہ تھی لیکن دمشق کے نقطہ نظر سے مفید ضرور ہو سکتی تھی۔ دمشق کا خیال یہ تھا کہ اگر امام زین

العابدینؑ اپنے اہل خاندان کے ساتھ عزت واحترام کے ساتھ اور جلد از جلد مدینے پہنچا دیئے گئے تو ممکن ہے بغاوت کا زور ٹوٹ جائے اور مدینے کے عوام امام زین العابدینؑ اور اہل بیتؑ کے قافلے کو اپنے درمیان پاکر ٹھنڈے ہو جائیں۔

واضح طور پر دمشقی بیوروکریسی کا یہ مقصد پورا نہیں ہوا البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہل بیتؑ کو رہا نہ کیا جاتا اور مدینے کی بغاوت ایسے وقت بھڑکتی کہ امام زین العابدینؑ قید خانہ دمشق میں ہوتے تو غالباً بغاوت اس سے کہیں زیادہ شدید ہوتی، جیسے ان کی رہائی کے بعد ہوسکی۔

تین کردار

63ھ شروع ہوا ہی تھا کہ مدینے کے باشندے دمشقی حکمران کے خلاف بغاوت کے لئے سڑکوں پر آ گئے۔ مدینے کی بغاوت اور واقعہ کربلا کے پیدا کردہ ردعمل کے نتیجے میں انقلابی ابھار پیدا ہوا اس سے خلافت کے مدعیوں کے لئے سازگار حالات مہیا ہو گئے تھے۔ چنانچہ عبداللہ ابن زبیر نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر مکے میں اعلانِ بغاوت کر دیا اور یزید کے خلاف بغاوت کی کال دے دی۔ انہوں نے کربلا کے مظالم کے تذکروں پر زور دار تقریریں کیں اور عوام کو دمشقی حکومت کا قلادہ اتار پھینکنے کا مشورہ دیا۔ اب اس وقت مسلم معاشرے کی فضا پر تین شخصیتیں نمایاں تھیں۔ مکے میں عبداللہ ابن زبیر مدینے میں امام زین العابدینؑ دمشق میں یزید بن معاویہ۔

سب سے پہلے عبداللہ ابن زبیر کو لیجئے وہ رجب 60ھ کے آخری ہفتے میں مدینے سے مکے گئے اور 2 شعبان کو مکے پہنچے اس وقت سے ڈھائی سال بعد یعنی 63ھ کے آغاز تک مکے میں رہے اور اس قیام کے دوران ایک مضبوط گروہ کے قائد بننے میں کامیاب

ہو گئے۔ ابن زبیر موقع کے منتظر تھے کہ واقعہ کربلا اور حادثہ مدینہ نے حالات کو ساز گار بنا دیا۔ انہوں نے اعلانِ خلافت کر دیا۔ یاد رہے یزید کو اس اعلانِ بغاوت سے ڈھائی سال پہلے اس کے باپ نے اپنے وصیت نامے میں واضح طور پر ابن زبیر کے مقاصد اور ممکنہ سرگرمیوں کے بارے میں متنبہ کر دیا تھا، تاہم ان کے اعلانِ خلافت تک یزید نے ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا۔ ہر چند کہ انہوں نے یزید کے گورنر ولید کی دعوت کو بھی مسترد کر دیا تھا اور مکے میں برابر اپنی طاقت کو مضبوط بھی کرتے رہے تھے تاہم تاریخ نہیں بتاتی کہ ان واضح سرگرمیوں کے باوجود یزیدی حکومت نے ان سے بیعت لینے پر اصرار کیا ہو۔

یزید جانتا تھا کہ وہ خلافت کے مدعی ہیں ابتداء میں اس نے بیعت کا مطالبہ بھی کیا تھا جسے انہوں نے مسترد کر دیا تھا لیکن یزید نے ایک اس شخص سے جو مدعی خلافت ہو اور مطالبہ بیعت سے بھی منکر ہو اور جس کے بارے میں باپ کا یہ مشورہ بھی موجود ہو کہ آدمی خطرناک ہے کوئی تعارض ضروری خیال نہ کیا اور تعارض کیا تو ان امام حسینؑ سے جو مدینے میں خاموش زندگی گزار رہے تھے۔ ویسے اگر آپ دمشق کے نقطہ نظر سے سوچیں تو عبداللہ ابن زبیر سے بیعت کا مطالبہ ایک بے معنی سا مطالبہ ہوتا اس لئے کہ اس مطالبے کی صورت میں عبداللہ ابن زبیر کے صرف دو ردعمل ممکن تھے ایک یہ کہ وہ بیعت پر راضی ہو جاتے دوسرے یہ کہ بیعت سے انکار کر دیتے۔ بیعت پر راضی ہونے کی صورت میں بات صرف وقتی طور پر ٹل جاتی اس لئے کہ ساز گار حالات پیدا ہوتے ہی وہ دعویٰ خلافت پیش کر سکتے تھے جبکہ انکار کی شکل میں ایک اور سنگین حادثہ رونما ہوتا جو اس مطالبے سے انکار کا منطقی نتیجہ ہوتا۔ اس لئے یزید نے ابن زبیر کو اپنے حال پر چھوڑ دینا مناسب خیال کیا۔

اب آپ امام زین العابدینؑ کے معاملے کو لیجئے۔ سوال یہ ہے کہ یزید نے کیوں

ان سے بیعت کا مطالبہ نہ کیا۔ وہی مطالبہ جو ان کے والد سے کیا تھا۔ ان سے بھی کیا جا سکتا تھا۔ امامؑ یزید کے پورے دور میں حیات رہے مگر یزید نے کبھی ان سے بیعت کرنے کے لئے نہ کہا۔ جبکہ یہ بات واضح ہے کہ وہ اہم شخصیت تھے مسلمان معاشرے کی، تاہم ان سے بیعت ضروری نہ خیال کی گئی۔ مطلب اس کا کیا ہوا؟ یہی تو نا کہ ایک ممتاز شخصیت یزید کی بیعت کئے بغیر بھی زندہ وسالم رہ سکتی ہے اور یہ بھی کہ امامؑ کی بیعت نہ کرنے سے یزید کی حکومت کو کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ ہر چند مدینے اور مکے کی بغاوتوں نے سازگار حالات پیدا کر دیئے تھے۔ ایسے سازگار حالات کہ عبداللہ ابن زبیر جیسے باخبر سیاست دان نے بغاوت کرنا مناسب خیال کیا تاہم امام زین العابدینؑ خاموش رہے اور اس خاموشی کو دمشق نے کسی مشکوک نظر سے نہیں دیکھا۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ امام زین العابدینؑ اپنے آپ کو امام یعنی خلیفہ سمجھتے تھے لیکن یزیدی حکومت کے ڈانواں ڈول ہوتے وقت بھی انہوں نے دعویٰ خلافت پیش کرنا ضروری خیال نہ کیا۔ جبکہ کربلا کے سانحے کا انتقام لینے کا جذبہ بھی اس بات کا متقاضی ہوسکتا تھا کہ وہ دمشق کی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر میدان میں اتر آتے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ ہوا یہ کہ امامؑ محض خاموش رہے اور مدینے کی بغاوت میں انہوں نے کوئی حصہ نہ لیا۔ واضح طور پر اس لئے کہ ان کے خیال میں امامؑ ہونے کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ غلط حکومت کے خلاف حالات کی عملی منطق دیکھے بغیر ہتھیار ضرور ہی اٹھائے جائیں۔

یہاں یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ واقعہ کربلا کے بعد اس خاندان کی اور ان کے ساتھیوں کی ہمت ٹوٹ گئی تھی اس لئے کہ صورت حال اس کے برعکس تھی۔ سانحہ کربلا نے اہل بیتؑ کے حامیوں کو منظم کر دیا تھا اور توابین کا ایک گروہ منظم ہو کر عملی سرگرمیاں شروع کر چکا تھا۔

حد ہے یزید کی موت کے فوراً بعد جب مختار ابن ابوعبیدہ ثقفی نے باقاعدہ اعلان جنگ کر کے ابن زیاد اور قاتلان حسینؑ کی بڑی تعداد کو قتل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تو بھی امام زین العابدینؑ نے اعلانِ خلافت کر کے تخت حکومت پر قبضہ کرنا ضروری خیال نہ کیا۔ اس لئے کہ ان کے خیال میں امام ہونے کیلئے حکمران ہونا ضروری شرط نہیں ہے۔ ٹھیک یہی اندازِ نظر امام حسینؑ اور امام حسنؑ اور ان کی اولاد کا تھا۔ ان کے خیال میں امامت یا خلافت روحانی قیادت کا عہدہ ہے جس کے لئے حکمران ہونے کی شرط موجود نہیں ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد جب یزید نے پیغمبر اسلامؐ سے انتقام لینے کی اپنی نہ دبنے والی خواہش پوری کر لی تو امام زین العابدینؑ سے کوئی تعارض ضروری نہ سمجھا چونکہ اس کے خیال میں وہ کوئی سیاسی رسک (risk) نہ تھے۔ سیاسی رسک تو امام حسینؑ بھی نہ تھے اور یزید یقیناً یہ بات جانتا تھا اس لئے اس کے پاس امام حسینؑ کے طرزِ عمل میں کسی ایسے اقدام کی شہادت موجود نہ تھی جو امامؑ کے سیاسی رسک ہونے کا ثبوت بن سکتی۔

امام زین العابدینؑ پر تو دمشق کو سیاسی رسک ہونے کا کچھ نہ کچھ شبہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ واقعہ کربلا کے بعد تو انہیں کی وہ جماعت جو کربلا میں اپنے امامؑ کی مدد نہ کرنے پر نادم تھی منظّم ہو کر یزیدی فوج پر شب خون مارنے کی برابر کوشش کرتی رہی تھی۔ یہ لوگ امام زین العابدینؑ کے حامی تھے اور اس لئے حکومت شام کے خیال میں امامؑ کی قید سے رہائی رسک یا خطرے کا کچھ عنصر ضرور رکھتی تھی، تاہم دمشق نے قافلہ اہل بیتؑ کو رہا کر دیا جبکہ صاف مطلب یہ ہے یزید خاندان اہلِ بیتؑ کے ایک امامؑ کی موجودگی کو جسے بہت سے آدمی امامؑ مانتے ہوں اور ہزاروں حق حکمرانی دلانے کیلئے یزیدی حکومت سے ٹکرا رہے ہوں، کوئی خطرہ خیال نہ کرتا تھا جبکہ امام حسینؑ کے مقابلے میں تو یہ صورتِ حال بھی نہ تھی نہ تو انہوں

نے تخت پر قبضے کا دعویٰ کیا تھا نہ انہوں نے فوج جمع کی تھی، نہ مطالبہ بیعت کے وقت کوئی منظّم گروہ تھا جو یزیدی حکومت سے ٹکر لے رہا ہو۔ پھر کیوں یزید نے بیعت کا مطالبہ پیش کر کے ایک عظیم فتنے کی بنیاد ڈالی۔ واضح طور پر اس لئے نہیں کہ حسینؑ سیاسی رسک تھے بلکہ محض اس لئے کہ یزید حسینؑ کے ناناؐ سے انتقام لینے کیلئے ادھار کھائے بیٹھا تھا اور اس لئے جب تک اس نے اپنی آتشِ انتقام بجھا نہ لی چین سے نہ بیٹھ سکا۔ وقتی طور پر تو واقعی اسے چین نصیب ہو گیا لیکن سیاسی طور پر 10 محرم 61ھ کے بعد ہی سے اس کے لئے بے چینی کا دور شروع ہوا جو اس کے اپنے دور سے گزر کر پورے اموی عہد پر چھا گیا تا آنکہ عالمِ اسلام کے بڑے حصے نے بغاوت کر کے پورے اموی دور کا مشرق میں خاتمہ کر ڈالا۔

63ھ کے تناظر میں تیسری شخصیت یزید کی ہے۔ 63ھ کا یزید ایک خاص اعتبار سے 60ھ کے یزید سے مختلف ہو گیا۔ گو جوہری طور پر وہ وہی یزید رہا جو 60ھ کے جمادی الثانی کے آخری ہفتے میں، یعنی تخت نشینی کے وقت تھا۔

واقعہ کربلا اور حادثہ حرہ یعنی مدینے کی تاخت و تاراج کے ذریعے اسلام اور بانی اسلامؐ سے وہ بھرپور انتقام لے چکا تھا۔ ان سانحوں کے ارتکاب کے بعد اس کے انتقامی اور عداوتی جذبات کی اشتعال کی آگ کچھ تو سرد پڑ چکی تھی مگر بجھی نہ تھی۔ وہ ایک جابر حکمران تو تھا ہی، اور اقتدار کو ہر قیمت پر بچانے کے اصول کا قائل۔ ویسے مکے کی بے حرمتی کے سانحے میں وہ اقتدار کی جنگ لڑنے کیلئے سامنے آیا تھا اور یہ جنگ اس نے اپنے مزاج اور نہاد کے مطابق لڑی تاہم یہاں اقتدار کا جذبہ اولین اور اسلام کی ایک محترم نشانی، مکے کی بے حرمتی کا خیال کسی درجے پر نہ رہا یعنی مطلب یہ کہ اسے عبداللہ ابن زبیر کو جو اس کے تخت کے لئے خطرہ بن گئے تھے ہر حال میں کچھ دینا تھا چاہے اس عمل میں مکے کی بے حرمتی ہی کیوں نہ ہو

جائے۔ مکے کی بے حرمتی کر کے ویسے بھی اس کا دل خوش ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ خیر سے یہاں بھی اسلام کو زک پہنچانے کا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا تاہم اولین مقصد عبداللہ ابن زبیر کی بغاوت کا فرو کرنا تھا اور اس کے لئے ہر قدم اٹھانا اس کے خیال میں جائز، جراثیم کی جنگ لڑنے یا شہری آبادیوں اور شفا خانوں وغیرہ پر بمباری کرنے کی ممانعت کے سے مہذب قوانین ایسے اصول تھے جو دمشق کے حکمران کے ذہن کے قریب سے بھی ہو کر نہ گزرے تھے۔ چہ جائیکہ مکے کا احترام جس کے خیال سے بھی غالباً وہ جھنجھلا اٹھا ہوگا۔ رسولؐ کے خاندان سے انتقام کا مرحلہ ختم ہو چکا تھا مگر اسلام سے انتقام لینے کا ایک اتفاقی موقع مہیا ہو رہا ہو تو یزید کیوں اس شاندار موقع کو ہاتھ سے جانے دے۔ چنانچہ اقتدار کی جنگ کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں مکے پر بھرپور وار کرنے کا جو موقع مہیا ہوا۔ یزید نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور کعبے کو منجنیقوں سے مسمار کر کے اسلام کی جناب میں ایک اور گناہ کا ارتکاب کرنے میں کسی تذبذب یا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کیا۔

تاریخ، تہذیب اور حسینؑ

اب تک ہم کربلا پر ان واقعات کے پس منظر میں سوچتے رہے جو حسنؑ معاویہ — معاہدے سے لے کر یزید کی موت تک رونما ہوئے لیکن سانحہ کربلا کچھ اور ابعاد بھی رکھتا ہے۔ جنہیں ذرا مختلف سطح پر رکھ کر دیکھنا ہوگا۔

کربلا کے ہیرو حسینؑ ابن علیؑ ہیں۔ حسینؑ نواسہ رسول اور امامؑ بھی۔ خاندانِ اہل بیتؑ کے محترم رکن بھی ہیں اور پیغمبر اسلامؐ کی محبت بھری حدیثوں کا موضوع بھی۔ مختصراً اپنی خاندانی اور مذہبی نسبتوں کے اعتبار سے مسلمانوں کیلئے حسینؑ ابن علیؑ کی شخصیت زبردست

ہیں اور کربلا مذاہب کے دائرے سے بلند ہو کر سب کی یکساں رہنمائی کرتی ہے۔ اکیسویں صدی میں اسی اساس پر انسانیت کے تہذیبی قافلے کو آگے چلانا ہے تاکہ اس کرۂ ارض پر اگر جنت نہیں بن سکتی تو ممکن طور پر جو بہتر معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اس کے تمام امکانات کو متحرک کیا جاسکے۔

کربلا کی یاد میں جو آنسو بہتے ہیں وہ مظلوم انسانیت پر بہائے جاتے ہیں۔ انسان کی مرتب تاریخ چھ (6) ہزار سال یا اس سے کچھ ہی زائد عرصے تک جاتی ہے۔ تاریخ سے پہلے ماقبلِ تاریخ کی مدت پانچ لاکھ سال تک فرض کی جائے تو ایک لاکھ سال کا زمانہ معاشروں کی تنظیم کا زمانہ ہے اور قیاسِ غالب یہ ہے کہ یہی زمانہ انبیاء سابق کا زمانہ رہا ہوگا اور یہ تھیوری پیش کی جاسکتی ہے کہ اس مدت کا زیادہ تر چھوٹے بڑے آمروں اور ڈکٹیٹروں کا زمانہ بھی تھا۔ جن کے خلاف تحریک چلانے والوں کو انبیاء یا دانشور کہا جاتا رہا۔ انسانیت کے ان دُکھوں کو دور کرنے کے لیے جو ظالموں کے ہاتھوں کمزور انسانوں پر نازل ہوئے جو مقدس روحوں نے جنگ کی ان سب کے ہیرو حسینؑ ابنِ علیؑ ہیں۔ دراصل حسینؑ کی کربلا کے المیہ کے سلسلے کے حوادث کے مجموعے پر جو آنسو بہائے جاتے ہیں وہ تاریخ کے ان تمام مظلوموں کی ستم زدگی کے لئے خراجِ عقیدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے تحفظ کے لئے قدیم مذہبی کتابیں، تمام ہیرو، جدوجہد کرتے رہے، تکالیف برداشت کرتے رہے، تورات، زبور، صحفِ انبیاء اور انجیل، ژند، پاژند اور اوستا، چاروں وید، گیتا اور پران ان تاریخ ساز کتابوں کی بزرگ شخصیتوں مہاتما گوتم بدھ اور مہاویر، یا تنگ نظری اور عصبیت کے خلاف جنگ کرنے والے فلسفیوں، دانشوروں اور ادباء نے جو قربانی انسانیت کو خانوں میں بانٹنے کے خلاف دیں اور ستم زدوں کی مصیبتوں میں سہارا دیا۔ کربلا ان سب کے مجموعے

احترام اور محبت کی آماجگاہ بنی رہی ہے۔ لیکن واضح طور پر یہ صورت حال مسلم معاشرے کے دائرے میں اطلاق رکھتی ہے اور یوں قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوگا کہ مسلم معاشرے کے دائرے سے باہر حسینؑ ان کی کربلا کہاں اپنی جگہ حاصل کرے گی؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ تاریخِ تہذیبِ انسانی میں حسینؑ ابن علیؑ کس مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ تاریخِ تہذیب سے مراد یقیناً شاندار محلات، زرق برق لباسوں، خوبصورت عمارتوں اور حسین زیورات وغیرہ کی تاریخ نہیں ہے۔ تاریخ تہذیب سے مراد سماجوں کا وہ ارتقائی سفر ہے جو انہوں نے شریفانہ اخلاقی اقدار کو اپنانے کے سلسلے میں کیا ہے۔ تاریخ کے تمام معاشرے ایسے طبقات پر بھی مشتمل رہے جو اپنی سرگرمیوں کو بہتر اخلاقی اقدار کے پیمانوں پر تولتے رہے۔ معاشروں کے ارتقاء کا یہی وہ رخ ہے جو صحیح معنی میں تاریخِ تہذیب کہلاتا ہے اور یہی وہ تاریخ ہے جس میں ہمیں ابن علیؑ کا مقام ڈھونڈنا ہے۔

منظّم مذاہب کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ بحث یہاں غیر ضروری ہے۔ یہاں سوال سامنے یہ ہے کہ امام حسینؑ روحانی قائد ہونے کے علاوہ جوان کا مقام مسلم معاشرے میں ہے اس تاریخ میں کس جگہ آتے ہیں جسے ہم تاریخِ تہذیب قرار دے رہے ہیں۔

اصولوں کی خاطر — ان اصولوں کی خاطر جنہیں افراد معاشرے کے ارتقاء یا سماجی بندھنوں کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ بااصول افراد برابر قربانیاں دیتے رہے ہیں۔ واضح طور پر حسینؑ ابن علیؑ اسی گروہ میں شامل ہیں لیکن سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر وہ شخص جو اصولوں کی خاطر قربانی دیتا ہے محترم خیال کیا جائے گا۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہے اس لئے کہ جو شخص بھی کسی اصول کے لئے قربانی دیتا ہے وہ اپنے فوری مفادات اور جسمانی خواہشوں کو ایک اس خیال یا نظریے کے لئے تج دیتا ہے جسے وہ اہم،

محترم یا مقدس خیال کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ اخلاقی ترازو میں ان عام لوگوں سے زیادہ بھاری ہوتے ہیں جو صرف اپنی خواہشوں کے تابع ہوتے ہیں اور اپنے خیال، اصولوں اور نظریات کو اپنے فوری مادی مفادات پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

تو یہ تو ہوئی ایک سطح انسانوں کی اضافی برتری کی۔ لیکن صرف یہ ہی سطح افراد کو عظمت اور اہمیت دلانے کی، کوئی بڑی ضمانت مہیا نہیں کرتی اس لئے کہ اصولوں پر قربانی کی گفتگو میں یہ سوال قدرتاً پیدا ہوگا کہ اصولوں کی قربانی کے سلسلے میں کون سے وہ اصول ہیں جو یہاں ہمارے پیشِ نظر ہیں مجموعی طور پر آپ اصولوں کو دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ پہلے تو قدرتاً ان اصولوں کی بات کیجئے جو تمام انسانوں کو اپنے دائرے میں لے لیتے ہیں اور بنیادی اخلاقی اقدار، عدل، مساوات، آزادئ رائے اور احترامِ فرد جیسی مقدس اساسوں پر زور دیتے ہیں جبکہ دوسری قسم کے اصول وہ ہیں جو انسانوں کو رنگ، نسل، علاقہ اور عقیدے کے دائروں میں بانٹ کر کسی ایک گروہ یا طبقے کے خیالات اور تصورات کو دوسروں پر ٹھونس دینے کے حامی ہیں یا اگر پہلے اصول کے حق میں اقتدار آ جائے تو ان منفی تصورات کے لئے بعض لوگوں کو قربانی دینے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ قربانی یہ آخر الذکر حضرات بھی دیتے ہیں لیکن قربانی کی حد تک قابلِ تقلید ہونے کے باوصف واقعی وہ کوئی محترم مقام پیدا نہیں کر پاتے۔ اس لئے کہ جن اصولوں کے لئے قربانی دی گئی ہے وہ محض منفی ہیں اور تہذیب کے سفر میں سنگین موانع حائل کرنے والے لہٰذا قربانی پر سوچتے وقت یہ پہلو ضرور سامنے رکھنا ہوگا کہ قربانی کے عقب میں کون سے اصول کارفرما ہے۔ تہذیب نواز یا وہ اصول جو تہذیبی اقدار کی لاشوں پر کھڑے ہو کر ٹھس لوگوں کو قربانی پر اکساتے رہے۔

سوال یہ ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ کی قربانی ان دو اقسام میں سے کس قسم کی قربانی

تھی؟ اس سوال کا جواب! ان واقعات میں ڈھونڈیئے جو کربلا کے ماضی میں گزرے اور جن سے کربلا 10 محرم کو دوچار ہوئی۔ بہترین قسم کی قربانی دینے والے بھی واضح طور پر دو حصوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔ پہلے وہ ہیں جو ان اچھے اصولوں کو ہر قیمت پر معاشرے میں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ ہر قیمت پر — کا مطلب یہ کہ وہ صرف مقاصد کے تقدس کا خیال رکھتے ہیں۔ ذرائع حصول مقاصد کو اہمیت نہیں دیتے یعنی ذرائع اور وسائل کے تعین میں اخلاقی اقدار کی پابندیاں ہر لمحے قبول نہیں کرتے۔ بعض بڑی اچھی تحریکیں کئی قابلِ اعتراض ذرائع کے استعمال سے یعنی اچھے اور بُرے دونوں قسم کے ذرائع کے استعمال کے ذریعے کامیابی سے ہمکنار ہوسکیں۔ لیکن اس قسم کی تحریکیں اگر کامیابی سے ہمکنار ہوئیں تو ذرائع کے انتخاب میں عدم احتیاط کی بناء پر تاریخِ تہذیب میں دوررس اثرات پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکیں اور شکست سے دوچار ہوگئیں۔

یوں یہ ان جیسے لیڈروں کی قربانیاں تو بہرحال قرار پائیں، تاہم کوئی بڑی علامتیں اخلاقی اقدار کی بننے میں کامیابی حاصل نہ کرسکیں۔

عام طور پر وہ تحریکیں ابھریں اور مشکل ہی سے کامیابی حاصل کرسکیں جن میں مقاصد کے تقدس کے ساتھ ساتھ ذرائع اور وسائل کے تقدس کو بھی یکساں اہمیت دی گئی تھی۔ اس جیسی تحریکیں عام طور پر افراد کی قربانی پر پہنچ کر ابھریں اور تاریخ کی پیشانی پر جھومر بن کر چمکتی رہیں۔

تاریخ گیر شخصیتیں

سقراط، عیسیٰؑ اور حسینؑ تین ان تاریخ گیر شخصیتوں کا نام ہے جن کی ذات سے

اعلیٰ مقاصد کے لئے قربانیاں دینے کا تصور وابستہ کیا گیا ہے اور جن کے اقدامات اخلاقی اقدار کی ترازو میں پورے اترے ہیں اور یوں یہ تینوں قربانیاں صفِ اول کی قربانیوں میں شامل سمجھی گئی ہیں لیکن ان تینوں شخصیتوں کی قربانی کی نوعیت میں نمایاں فرق بھی ہے۔ اتنا بنیادی فرق کہ معاملات کو پرکھتے وقت اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سقراط اور عیسیٰؑ دونوں کی قربانیوں نے تاریخ پر بڑا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ دنیا کے دو بڑے مذاہب، عیسائیت اور اسلام نے واقعہ صلیب کو مختلف انداز پر لیا ہے۔ لیکن اس اختلاف سے قطع نظر حضرت عیسیٰؑ کی صلیب سے تاریخ کے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں محبت، خدمت اور انسان دوستی کے جذبات کی جوت جگائی ہے تاہم عیسیٰؑ حکومت سے متصادم نہیں ہوئے تھے ان کو صلیب پر چڑھانے کا بندوبست یہودی فریسیس (Pharises) کی سازشوں نے کرایا تھا۔ جن کے مفادات حضرت عیسیٰؑ کی تبلیغ سے مجروح ہو رہے تھے۔ قربانی عظیم ثابت ہوئی اور تاریخ پر دیرپا اثر چھوڑنے کا باعث، تاہم وہ ڈرامائی حالات جو سقراط کی قربانی کے ساتھ وابستہ ہوئے تھے اور جو کربلا کے پس منظر اور پیش منظر میں موجود رہے صلیب چڑھنے کے اس سانحے میں نظر نہیں آتے۔

سقراط کی قربانی بڑے یادگار، حیرت انگیز اور محبت خیز ڈرامائی حالات میں پیش آئی اور اس لئے اس نے تاریخ کی ذہین اور شریف روحوں کو ہمیشہ تڑپائے رکھا۔ سقراط ایک ذہنی انقلاب لانا چاہتا تھا یہ ذہنی انقلاب آ گیا اور تاریخ اس عظیم ہیرو کا نام احترام سے لیتی ہے اور ہمیشہ لیتی رہے گی۔ اس لئے کہ سقراط نے فکرِ انسانی کو جلا دی، اس نے تہذیب کی بنیادوں کو استوار کیا۔ سقراط شہیدِ فکر و فلسفہ قرار پایا اور یہ وہ اعزاز ہے جو اس کا نام ہمیشہ روشن رکھے گا۔

دوسرے فلسفیوں کو بھی ان کے فلسفیانہ نظاموں کی توضیح یا تشریح کے جرم میں سزائیں دی گئیں لیکن کسی کو سقراط کے علاوہ اس جرم میں سزا نہیں دی گئی کہ اس نے محض فکری جلا پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔

دو چیزوں میں فرق ہے۔ ایک ایسے فلسفیانہ نظام کی تشہیر جسے معاشرہ ملحدانہ قرار دیتا ہو ایک الگ موقف ہے جبکہ نوجوانوں کی فکر میں حرکت پیدا کرنا ایک بالکل جداگانہ موقف۔

وہ فلسفی جنہوں نے اپنے فکری نظاموں کے لئے قربانی دی ان کا بہت بڑا مقام ہے اور یادگار قربانی، تاہم اپنے ناموں کے حامی ہونے کی بنا پر ان کی انا بھی اس قربانی کو برداشت کرنے میں شامل رہی جبکہ سقراط کی انا کسی متعین نظام سے اس کی عدم وابستگی کی بنا پر اس قربانی میں محرک عنصر کی حیثیت حاصل نہ کرسکی اور یوں سقراط کا درجہ نسبتاً بلند رہا۔ یہ بات حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی — حضرت عیسیٰؑ ایک تحریک کے بانی تھے۔ یہ تحریک کتنی بھی بڑی اور عظیم و محترم کیوں نہ ہو تاہم خود تحریک سے ان کی شخصیت کی وابستگی ان کے انفرادی عنصر کو شامل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے جبکہ سقراط کسی خاص معاشرتی نظام کا داعی بن کر ایک تحریک کا بانی نہ بنا تھا اور اس لئے اس کی سرگرمیوں میں انا کے انفرادی عنصر کے بجائے ذہن کے فکری تقاضوں کا عنصر تھا ذہن کے یہ فکری تقاضے کسی معین سیاسی اور سماجی نظام سے وابستہ نہ تھے لہٰذا انا کا انفرادی عنصر سقراط کے یہاں موجود نہ تھا۔ یوں سقراط کی قربانی انسانی عنصر سے کم سے کم وابستہ تھی اور اس لئے انسانی تہذیبی اعتبار سے زیادہ وسیع الاطلاق۔ بنابریں اس کی اہمیت بھی زیادہ قرار دینا پڑے گی۔

مذکورہ تجزیے کی روشنی میں آپ جو نتیجہ نکالیں گے وہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں اگر سب سے زیادہ عظیم اور تاریخ گیر قربانیوں کو چنا جائے تو سقراط اور حسینؑ کی قربانی بالکل

صفحہ اول پر آتی ہیں۔ آپ ذرا زیادہ گہرائی میں اتر کر بنیادی تہذیبی اقدار کے معیار پر ان دونوں قربانیوں کا جائزہ لیں تو پھر کیا صورت پیدا ہوگی؟

آیئے! اب اس سوال پر سوچیں لیکن اس سوچ کو شروع کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا اور طے کرنا ضروری ہے کہ واقعی کونسا مسئلہ اور اس مسئلے کا کون سا پہلو ہے؟ جو ہمارے سامنے ہے۔ سقراط نے انسانی فکر کو جلا دی اور یہ ایسا کام ہے جس کی تاریخی عظمت ہر اعتبار اور ہر پہلو سے اعتراف کی مستحق ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں سقراط فلسفیوں میں نمایاں نظر آتا ہے — ادھر حسینؑ ابن علیؑ کی قربانی ہے جس میں خیر و شر کو تہذیب کی ترازو میں تولنے کا کارنامہ انجام دیا گیا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں حسینؑ تمام شہداء کے سرخیل نظر آتے ہیں لیکن یہاں مسئلے کے اس پہلو کو زیر بحث لانے کے بجائے قربانی کی نوعیت اور حیثیت پر غور کیجئے؟ غور یہ کیجئے کہ حسینؑ کی قربانی کس منزل پر آتی ہے اور سقراط کی قربانی کا کیا مقام ہے۔ مسئلے کا اگر آپ بہ نظرِ غائر جائزہ لیں تو ان دونوں قربانیوں میں جوہری فرق نظر آئے گا اور یہ فرق کمی نہیں ہوگا کیفی ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ حسینؑ کی قربانی ایک ایسی نوعیت رکھتی ہے جس کی دوسری مثال تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ کیوں موجود نہیں ہے؟ کئی بنیادی امتیازات کی بناء پر جو کربلا کے واقعے میں موجود ہیں اور قربانیوں کے دوسرے طویل سلسلوں اور داستانوں میں نظر نہیں آتے جو اصول نواز انسانوں نے جبر کے خلاف دی ہیں۔

بنیادی امتیازات

استبداد اور جبر سے متصادم ہونے والوں کی تعداد خاصی طویل ہے۔ لیکن وہ اختصارات جو کربلا کے المیے کی دردناک لڑیوں میں ایک ساتھ پرو دیئے گئے ہیں قربانی کے کسی اور المناک سانحے میں ایک جگہ جمع نہ ہوسکے۔ ایک واضح حقیقت جو حسینؑ کی قربانی

میں موجود ہے وہ تاریخ تہذیب کو کہیں اور نہیں ملی۔ وہ طویل شعوری پس منظر ہے جو کربلا کی دس محرم کی سہ پہر سے پہلے گزرا۔ ایک مکمل شعوری موقف ہے جو ترپین ہجری 53ھ میں ایک بااصول شخص — حسینؑ ابن علیؑ — نے قائم کیا اور کوئی سات سال بعد تک اسی موقف کے تحت اپنی جان قربان کردی۔ اپنے پورے خاندان اور رفقاء کی قربانی پیش کردی۔ یزید کے والد نے بیعت کا مطالبہ سب سے پہلے 53ھ میں کیا تھا۔ اس مطالبے کا معقول جواب — انقلاب و بغاوت — سے دیا جاسکتا تھا، لیکن انقلاب اور بغاوت کی ناکامی ہر معروضی منطق کی رو سے یقینی تھی — حسینؑ وضاحت سے جانتے تھے کہ دمشق کی حکومت کا تختہ الٹ دینا ممکن نہیں ہے۔ حسینؑ انقلاب کی کال دے سکتے تھے۔ یہ کال ناکام ہوتی۔ ان کے بھائی امام حسنؑ دمشق سے مصالحت کرنے پر جن حالات میں راضی ہوئے تھے ٹھیک وہی حالات حسینؑ کے سامنے تھے۔ حسینؑ کوئی جذباتی اور سریع الغضب آدمی تو تھے نہیں کہ پُرجوش جذبات کے دباؤ میں ایک ایسی بغاوت کا اعلان کردیتے جس کا ناکام ہوجانا صاف نظر آرہا تھا۔ موت کا خیر مقدم کرنے کیلئے وہ ہر وقت تیار تھے۔ لیکن موت کو اپنی مرضی ہی سے بلانا ہو تو پھر موت کا وقت اور حالات طے کرنے کا حق بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ پوری نسل انسانی میں کسی بھی شخص کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوسکا کہ وہ اپنی موت کا وقت، اس کا انداز اور ان حالات کو مہیا کرنے کا حق حاصل کرسکے جن میں موت کو دعوت دینا ہو اور یہ سب کچھ پورے شعوری منصوبے کے ساتھ، ایک ایسے منصوبے کے ساتھ جو مالۂ، پر بھی پورا غور کرلیا گیا ہو اور ماعلیہ پر بھی اور جس میں نہ مایوسی کو کوئی دخل ہو، نہ غیض وغضب کو، نہ جذبات کو — نہ انتقامی جذبے کا عنصر شامل ہو نہ کامیابی کا امکان موجود ہونے سے مادی فتح حاصل کرنے کی خوش فہمی — مطالبہ بیعت پیش ہونے کے فوراً ہی بعد حسینؑ نے چند بنیادی

فیصلے کر لیے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بیعت نہیں کریں گے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اعلانِ بغاوت یا انقلاب نہیں کریں گے اس لئے کہ اس کا ناکام ہونا یقینی تھا اور اس ناکامی کے نتیجے میں حکومت کو یہ عذر ہاتھ آجائے گا کہ حسینؑ ابن علیؑ معاشرے میں فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ شہادت تو حسینؑ کی یوں بھی ہوتی مگر اس سوال کا جواب کوئی نہ ہوتا کہ ہار کے طے شدہ ہونے کی صورت میں بغاوت کا اعلان کیا ہی کیوں گیا۔ جس شخص نے موت کا استقبال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو اس کے لئے انقلاب یا بغاوت کی کال دے دینا سب سے آسان کام ہوتا ہے، لیکن حسینؑ عام انقلابیوں کی طرح نہیں تھے کہ وقتی جذبات اور غصے میں آکر میدان میں اتر جاتے ان کے ہاں صورتِ حال شعور کی ترازو میں تل رہی تھی، وہ کوئی ایسا قدم اٹھانے کو تیار نہ تھے جو دمشق کے لئے کوئی عذر مہیا کر دیتا کہ واقعات کو حرکت میں لانے کا آغاز حسینؑ ابن علیؑ کے اس اقدام سے ہوسکا جو اگر وہ نہ کرتے تو المناک حالات کا وہ سلسلہ رونما نہ ہوتا۔ جس نے مسلم تاریخ کو لرزا کر رکھ دیا۔ انہوں نے دمشق کے اس وظیفے تک کو جو — حسنؑ معاویہ — معاہدے کی رو سے وہ لے رہے تھے، لینے سے اس لئے انکار نہ کیا ایک تو ان پر معاہدہ منسوخ کرنے کی ذمہ داری آجاتی دوسرے دمشق پر یہ دباؤ پڑتا کہ وہ حسینؑ سے براہ راست متصادم نہ ہونے کی جس پالیسی پر عامل ہے اسے بدل دے۔ گویا المناک حوادث کے آغاز کیلئے حسینؑ کا یہ اقدام ایک عذر۔ جواب اور محرک بن جاتا اور کربلا واقعاتی تسلسل کے جس نقطے پر آئی اس کی پہلی کڑی حسینؑ کا اپنا اقدام بن جاتا۔ یزید کے باپ امام حسینؑ سے ڈائریکٹ کنفرنٹیشن (راست اقدام) سے بچتے تھے۔ مناسب اور ہوشمندانہ بات یہ تھی کہ امامؑ بھی کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو براہِ راست تصادم پر دمشق کو مجبور کر دے۔ اخلاقی سیاست کی پوری بساط حسینؑ ابن علیؑ کے سامنے تھی۔ اس طرح کی

بساط تمام سیاست دانوں اور خاص طور پر انقلابیوں کے سامنے ہوتی ہے۔ لیکن امام حسینؑ کے یہاں اختصاص یہ ہے کہ وہ زندگی کو بچانے کی جنگ نہیں لڑ رہے تھے، زندگی کو قربان کرنے کی جنگ لڑ رہے تھے اور اس لئے ساری بساط ان کی مرضی کے تحت آ گئی تھی۔

شکست کے لئے

تمام سیاست دان اور تمام انقلابی فتح اور کامرانی کیلئے میدان میں اترتے ہیں، مگر حسینؑ شکست کھانے کے لئے میدان میں اترے تھے اور یہ واضح ہے کہ یہاں شکست سے مادی شکست مراد ہے۔ جس طرح فتح سے بھی مادی فتح مراد ہے۔ حسینؑ بیعت سے انکار کی قیمت ادا کرنے کے لئے شروع سے تیار تھے۔ یہ ان کا شعوری فیصلہ تھا۔ ان کا شعوری فیصلہ یہ بھی تھا کہ موت کو جذباتی انداز میں یا غیض وغضب کے عالم میں قبول نہیں کرنا۔ حیات ایک مقدس امانت ہے جسے ہر حال میں بچانا ہے لیکن اس — بہر حال — میں بنیادی اخلاقی اقدار کی قربانی شامل نہیں ہے۔ واضح طور پر بیعت کا صرف مطالبہ جان کی قربانی کا جواز نہیں بنتا۔ قربانی کا جواز صرف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب بیعت اور موت میں سے کسی ایک کے انتخاب کرنے کی صورتِ حال سامنے آ جائے یہ صورتِ حال یزید کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے موجود نہ تھی۔ امکان موجود ہونے کا اس وقت پیدا ہو جانا جب امامؑ دمشق سے وظیفے کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔ وظیفہ قبول کرنے سے امکان پیدا ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ امامؑ نے — حسنؑ معاویہ — معاہدے کو اپنی طرف سے مسترد کر دیا۔

یہاں ایک لمحہ رک جائیے اور یہ سوچئے کہ ہم کس نقطے پر پہنچ گئے ہیں اور کیا کر

رہے ہیں۔ یزید کے باپ اپنے کئی اقدامات سے مذکورہ معاہدے کو توڑ چکے تھے لیکن امامؑ نے ہر بار یہی کہا تھا کہ ہم اپنی طرف سے معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ وظیفہ لینے سے انکار امامؑ کی طرف سے معاہدہ مسترد کرنے کا اعلان ہوتا۔ امام حسنؑ اور دمشق کے حکمران کے درمیان معاہدہ دونوں فریقوں کے درمیان امن برقرار رکھنے کی دستاویز تھا۔ لہٰذا اس معاہدے کے استرداد کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ صورتِ حال پھر لوٹ آئی جو اس معاہدۂ امن سے پہلے موجود تھی۔ بالالفاظ دیگر خاندانِ اہلِ بیتؑ اور دمشق کے مابین حالتِ امن کے بجائے حالتِ جنگ پیدا ہوگئی۔ آپ نے غور کیا بات کہاں سے کہاں تک پہنچی۔ دمشق سے امام حسینؑ کا وظیفہ لینے سے انکار معاہدۂ امن کے استرداد کے ہم معنی یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اعلانِ جنگ کے مترادف ہوتا۔ آپ یہ نہ کہیں کہ دمشق اس معاملے کی خلاف ورزی کر کے پہلے ہی اعلان جنگ کر چکا تھا۔ واقعی دمشق کی طرف سے اعلانِ جنگ بار بار ہو چکا تھا مگر یہ بات صاف ہے کہ یہ اعلانِ جنگ صرف اعلانِ جنگ ہی تھا، آغازِ جنگ نہ تھا۔ آغازِ جنگ یہ اس وقت بنتا جب فریقِ ثانی بھی اس معاہدے کو مسترد کرنے کا اعلان کرتا۔ اس مرحلے پر حسینؑ ابن علیؑ امن کے پیغامبر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ دمشق کی طرف سے بار بار اشتعال انگیزیاں کی جا رہی تھیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اشتعال انگیزیوں کے اس تسلسل کی وجہ سے جوابی غیض وغضب کا مظاہرہ کرتا مگر حسینؑ ابن علیؑ ایک بالکل مختلف شخصیت تھے۔ اس مرحلے پر امن کے باقی رکھنے نہ رکھنے کا فیصلہ انہیں کرنا تھا۔ غصہ اور اشتعال کا تقاضا تو یہ تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں تو اینٹ ہی سے دے دیا جائے لیکن حسینؑ نے جن کا ایک فیصلہ امن اور جنگ کے درمیان حائل تھا، امن کو برقرار رکھا ایک دن نہیں، ایک سال نہیں۔ پورے سات سال تا آنکہ دمشق کے حکمران کا انتقال ہو گیا اور یہ

اور علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مرثیہ، کربلا کے توسط سے دراصل تاریخ کے دردانگیز حوادث کے لئے اظہارِ عقیدت کا ایک منظم انداز ہے۔

مرثیہ ہیومنزم کے وسیع تناظر میں مظلوم انسانیت کے مصائب سے ہمدردی پیدا کرنے کا مؤثر وسیلہ ثابت ہوتا ہے۔ اردو مرثیہ انیسویں صدی کے اختتام تک اپنی تشکیل اور ساخت میں واقعاتِ کربلا کے مصائب سے تعلق رکھتا تھا لیکن بیسویں صدی اور خاص طور پر پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب برصغیر میں سماجی اور معاشرتی مسائل پہلے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئے تو مرثیے کے ابعاد اور جہتیں پھیلنی شروع ہوئیں اور کربلا کے انقلابی پہلوؤں کی معنویت کا احساس تابناک ہوگیا۔ یوں ایک نیا ارتقائی دور آیا جس میں کربلا کے ان پہلوؤں کا ادراک گہرا ہوا جس کی طرف پہلے کم توجہ دی گئی تھی۔

کربلا اپنے وسیع اطلاق میں ایک انقلابی پیغام کی حیثیت بھی رکھتی۔ عوامی تحریکوں کی قربانیوں کے دوران چاہے وہ کہیں بھی دی جارہی ہوں کربلا کی علامت جو تاریخ کی سب سے روشن علامت کے طور پر سامنے آئی ایک انتہائی موزوں آئیڈیل کے انقلاب ہر جگہ اسٹیٹس کو و (status quo) سماجی حالتِ موجود کو چیلنج کرتا ہے۔ حسینؑ کی اپنی شخصیت 60 ہجری کے مسلم معاشرے کے نظام کے لئے ایک چیلنج تھی۔ گو انہوں نے عملاً کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا تھا جس پر دربارِ دمشق بغاوت کا الزام لگا سکتا۔ گو یہ صحیح ہے کہ کربلا والے بلکہ تمام خاندانِ اہلبیتؑ زندگی گزارنے کے اس ڈھنگ اس سوچ کی حیثیت رکھتے تھے جو دمشق والوں کی سوچ، جذبات و احساسات سے بالکل متضاد سمت میں جاتے تھے۔ ہر چند لاء اینڈ آرڈر کے قیام کا مروج عذر دمشق کے پاس موجود نہ تھا تاہم وہ تاریخی جرم کرلیا گیا جس سے پورا اسلام لرز اٹھا۔ نظامِ اخلاق کی پوری تاریخ کانپ گئی۔

خاصی بڑی مدت براہ راست تصادم اور جنگ کی صورتِ حال میں بدلنے سے بچ گئی۔ اس تمام مدت کے حالات امن سے گزر جانے کا کریڈٹ امام حسینؑ کو جاتا ہے جو اس عرصے میں امن کے پیغامبر کی حیثیت سے تاریخ میں نمایاں ہو کر سامنے آئے۔

دیکھا آپ نے کتنا مسائل خیز مسئلہ تھا۔ وظیفہ لیتے رہنے یا مسترد کرنے کا معاملہ، یہ سوال صرف کسی رقم کا نہیں تھا۔ یہ مسئلہ لگ بھگ سات سال تک امن برقرار رکھنے یا ان المناک حوادث کو ٹالنے کا مسئلہ تھا۔ جو مال کار دس محرم پر منتج ہوئے۔ مسلم معاشرے کے نگراں حسینؑ ابن علیؑ تھے، دمشق کے حکمران نہ تھے اور اس لئے معاشرے کو خانہ جنگی سے بچانا اور اس نقطے تک پہنچنے سے روکنا جہاں کربلا ناگزیر ہو جائے۔ حسینؑ کی ذمہ داری تھی کربلا جہاں مسلم معاشرے کا جھومر ہے۔ تاریخ اسلام کا دردناک سانحہ بھی ہے جس نے سماج کو دو واضح مخالف طبقوں میں بانٹ دیا۔ 53ھ سے لے کر 61ھ کے آغاز تک حسینؑ ابن علیؑ جس انداز میں معاملات سے عہدہ برا ہوئے اس نے المیہ کربلا کے اختتامیے کو تہذیبی قدروں کی حسین ترین علامت بنا دیا۔ لیکن ان مابعدی نتائج کی وجہ سے جو امامؑ کے غیر معمولی کردار کی وجہ سے رونما ہو سکے، ان اقدامات کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی جو امامؑ نے خانہ جنگی کو ٹالنے اور کربلا کے عروجی نقطے تک کشیدگی کو پہنچنے سے روکنے کے لئے کئے تھے۔ حسینؑ کے ان اقدامات نے انہیں امن کا سمبل بھی بنا دیا جس طرح وہ شہادت کا سمبل بن کر تاریخ کے سامنے آئے۔

شعوری اقدامات

تو بہر حال حسینؑ کے تمام اقدامات شعور کی پوری تابناکی میں انجام پذیر ہوئے

تھے۔ کسی بھی فیصلہ کن نقطے پر جذبات ان کے ہوش مندانہ اقدامات پر غالب نہ آسکے۔

امیرِ شام کے پہلے مطالبہ بیعت کے وقت ہی سے حسینؑ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اخلاقی جنگ کی اس بساط پر اپنا آخری مہرہ اپنی جان کو بنائیں گے۔ تاہم انقلابی یہی فیصلہ کرکے قدم اٹھاتے ہیں لیکن جہاں حسینؑ ابن علیؑ دوسروں میں نادر حیثیت اختیار کرجاتے ہیں وہ یہ حقیقت ہے کہ تمام دنیا کے انقلابی لیڈروں کے سامنے ہمیشہ دو امکانات رہے ہیں۔ انقلاب کامیاب ہوجائے تو فتح ان کے قدم چومے گی اور ناکامی پر پہنچے تو شکست کا خطرہ پیش آئے گا۔ انقلاب برپا کرنے والے عموماً رجائیت پسند ہوا کرتے ہیں اس لئے وہ شکست کو صرف دوسرے ممکن بدل کے طور پر رکھتے ہیں۔ ان کی پہلی توقع فتح مندی سے وابستہ ہوتی ہے لیکن امام حسینؑ کے یہاں صورتِ حال مختلف تھی۔ ان کے یہاں دو بدل، دو ممکن راستے ابتدا سے موجود نہ تھے۔ بدل صرف ایک ہی تھا شہادت۔ جسے انہوں نے خود اپنی مرضی سے چنا تھا کسی کے دباؤ سے نہیں۔

حسینؑ — نواسۂ رسول کو شہید کرنے کے عظیم گناہ سے ہر شخص کو بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے شروع سے آخر تک کوشش کی۔ یزید، ابن زیاد اور شمر اس شومئی قسمت سے بچ نکلیں، جس کی طرف وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

یوں آپ دیکھیں تو کربلا کسی وقتی جذباتی ردعمل کا نتیجہ نہ تھی یہ ایک طویل شعوری فیصلے کا منطقی اختتام تھا حسینؑ نے یہ فیصلہ مطالبہ بیعت کے پہلی بار پیش ہونے کے وقت ہی کرلیا تھا۔ تاریخ میں کسی اور انقلابی ہیرو کی اس نوع کی صورتِ حال موجود نہیں ہے کہ وہ شروع سے شکست کا یقین اور شہادت کا فیصلہ کرکے اپنے اقدامات کا اس طرح تعین کرے کہ کوئی قدم اخلاقی معیار سے فروتر نہ ہوجائے، کوئی اقدام جذباتی رو میں عمل میں نہ آجائے

اور کوئی ایسی سرگرمی نہ ہو جائے جو حالات کے آغاز کی ذمہ داری امامؑ کے کاندھوں پر ڈال دے۔ جذبات جوش وغضب یا فتح و کامرانی کی دل خوش کن توقعات بغیر خالص اصولی و نظریاتی سطح پر ایک ایسے موقف کو طے کرنا جو فرد کی اپنی موت کی اساس پر قائم ہو اور جس میں سارے اقدامات اس بات سے متعین ہو رہے ہوں کہ جان کی قربانی دینے کے موزوں تر حالات کون سے ہیں یعنی کب اخلاقی اقدار اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ حیات جیسی سب سے بڑی دولت کی قربانی پیش کر دی جائے۔ یہ کام صرف حسینؑ ابن علیؑ سے ممکن ہو سکا ہے۔ یہ صرف حسینؑ ابن علیؑ کی قربانی ہے جو مسلسل سات سال اس لئے ٹلتی رہی کہ حیات جیسے عظیم اثاثے کا بھینٹ چڑھا دینا واضح اور ناگزیر اخلاقی منطق کی رو سے موزوں قرار نہ پا سکا تھا۔ حیات ایک بہت بڑی قیمت ہے جسے یوں آسانی سے ضائع کر دینا ہوش مندانہ بات نہیں ہے۔ حیات کی قربانی کا مرحلہ اخلاقی ناگزیریت کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہ ناگزیریت صرف دس محرم کو پیدا ہوئی تھی، تاہم دس محرم کو بھی جسمانی قوت کے مظاہرے کا چانس موجود تھا۔ اس لئے حسینؑ نے بہادری کے اظہار کے اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا یعنی یہ نہ ہوا کہ وہ دشمنوں کو گرفتار کر لینے کی سہولت مہیا کر دیتے جبکہ گرفتاری سے بچ کر، جس کو جس کا آخری نتیجہ بھی موت تھا۔ بہادری کے ساتھ قربانی پیش کر دینے کا امکان موجود تھا۔ حسینؑ نے اس امکان کو پوری طرح استعمال کیا اور وہی شخص جو سات سال تک براہ راست تصادم سے بچنے کے ہر موقعے سے فائدہ اٹھاتا رہا تھا۔ اس بہادری سے کربلا میں لڑ کر شہید ہوا کہ تاریخ اس کی جرأت کے کارناموں کی تعریفیں کرتی نہیں تھکتی۔

حسینؑ دس محرم کو کربلا میں شہید ہو گئے۔ کربلا میں ان کا قیام تقریباً ایک ہفتے رہا۔ انہوں نے یہ تمام مدت باعزت مفاہمت تک پہنچنے کی سعی میں گزاری۔ انہوں نے سانحہ

کربلا کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ارسطو کو جب یہ خطرہ لاحق ہوا کہ ایتھنز کے رہنے والے اس کے ساتھ وہی سلوک کر گزریں گے جو سقراط کے ساتھ کر چکے ہیں۔ تو یہ کہہ کر وہ ایتھنز سے ہجرت کر گیا کہ میں دوبارہ اہلِ ایتھنز کو فلسفے کی بارگاہ میں گناہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ امام حسینؑ مسلم معاشرے کو کلنگ کا ٹیکہ لگنے سے بچانے کیلئے ہر ممکن کوشش کرتے رہے لیکن جب تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو انہیں انتہائی جرأت اور بہادری کے ساتھ اپنی اور اپنے رفقاء کی جانوں کی قربانی پیش کر دی۔

ڈی سینٹر۔ منحرف

جدید اصطلاح میں بات کو سمجھا جائے تو حسینؑ ابن علیؑ تاریخ کے پہلے ڈی سینٹر (dissenter) ہیں۔ انقلابی اور ڈی سینٹر، منحرف، میں جوہری فرق ہے۔ انقلابی حکومت کا تختہ الٹ کر سلطنت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں مگر ڈی سینٹر، منحرف، حکومت سے اختلاف تو رکھتے ہیں مگر اپنے مزاج اور کردار کے پیش نظر ایسے لوگ نہیں ہوتے جو بغاوتیں منظّم کیا کریں۔ ڈی سینٹر عام طور پر دانشور ہوتے ہیں جو نظریاتی اور شعوری پختگی کے حامل تو ہوتے ہیں مگر عملی طور پر انقلابی گروہوں کو منظّم کرنے کے رجحان کے مالک نہیں ہوتے۔ عہد جدید کے عظیم سائنس دان سخاروف میخرف۔ منحرف بھی رہے اور حکومت سے اختلاف کا اظہار بھی کرتے رہے مگر زیرِ زمین انقلابی سرگرمیاں منظّم کرنے کی طرف مائل نہیں ہوئے۔

دنیا کے دانشوروں اور فنکاروں کی عظیم اکثریت حکومت سے خوش نہیں رہی بلکہ عام حکمرانوں سے تو دلی نفرت کرتی رہی مگر خال خال ایسے واقعات بھی گزرے کہ اقدار تحریکوں کو منظّم کرنے کی طرف متوجہ ہو سکے یا اس میں کامیابی حاصل کر سکے۔ منحرفین،

اقدار نواز ہوتے ہیں اس لئے انہیں انقلاب برپا کرنے کے سلسلے میں جو مفاہمتیں کرنا پڑتی ہیں اس سے وہ کارہ رہتے ہیں۔ بنابریں عموماً ان کا انحراف خود ان کی اپنی زندگیوں کے دوران بمشکل ہی کسی انقلاب کا سبب بنتا ہے۔ گو یہی منحرفین اپنے نظریوں کی تبلیغ یا اظہار کی وجہ سے ہر بڑے اور ٹھوس انقلاب کا سبب بنتے ہیں۔ ان دانشور منحرفین کے سرخیل حسینؑ ابن علیؑ ہیں۔ وہ خود انقلابی نہیں تھے۔ انہوں نے کوئی انقلاب منظّم نہیں کیا۔ کسی باغی گروہ کی بنیاد نہیں ڈالی لیکن حسینؑ کی شہادت ان انقلابوں کا نقطہ آغاز بن گئی، جو تاریخِ اسلام کے نیم دانشور انقلابیوں نے خیر کی کامیابی اور شر کی شکست کے لئے برپا کیے اور جو تاریخِ اسلام کے اس سب سے بڑے عوامی انقلاب کا باعث بن گئے جس نے اموی حکومت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ جدید عہد کے سارے منحرفین اپنی سرگرمیوں میں امام حسینؑ کے پیرو ہیں جنہوں نے ظالم حکومت سے اختلاف اور انحراف کرنے کی سب سے بڑی مثال قائم کی ہے البتہ عام منحرفین اور حسینؑ ابن علیؑ کے انحراف میں بھی ایک فرق ہے۔ عام منحرفین حکومت سے اپنے اختلاف کا علی الاعلان اظہار اور تبلیغ کر کے حکومت کے لئے کسی نہ کسی درجے میں رسک ضرور بنتے ہیں لیکن حسینؑ ابن علیؑ نے حکومت کے لئے اس قسم کا کوئی — رسک — بننے کا عذر مہیا نہیں کیا۔ اس کا سبب حکومت کا خوف نہیں تھا۔ حسینؑ ابن علیؑ اور حکومت کا خوف دو متضاد تصورات ہیں جو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ بات یہ ہے کہ صورتِ حال کی منطق جس سمت میں جا رہی تھی حسینؑ اُس کے تمام ارتقائی مراحل اور اس کے اختتامیے سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے اور — بارہا اس کا ذکر بھی کر چکے تھے کہ حالات مآلِ کار ان کی شہادت پر منتج ہوں گے۔ واقعات کے اس نقطے تک پہنچنے کی ذمہ داری وہ اپنے کاندھوں پر اٹھانا نہ چاہتے تھے تاکہ تاریخ میں واقعہ کربلا صاف اور ستھرے انداز میں

سامنے آئے اور کسی نقطے پر یہ کہنے کا موقع نہ مل جائے کہ اگر امام حسینؑ ایسا نہ کرتے تو واقعہ کربلا رونما نہ ہوتا۔ تاریخ میں انہوں نے اپنے لئے حیرت انگیز موقف چنا تھا یعنی ایسا موقف جواب تک کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ حسینؑ ان پُرامن شہریوں کے ہیرو کی طرح تاریخ کے اسٹیج پر آئے ہیں جو جابر حکومت کے جبر وظلم کے مخالف ہونے کے باوجود انقلاب کے لئے ناسازگار حالات کی بناء پر ایک پُرامن شہری کی طرح زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ تاریخ جس انداز پر چلی اس کا منطقی تقاضا یہ تھا کہ امامؑ کا صرف وجود ہی حکومت کے خلاف انحراف کی حیثیت حاصل کر گیا تھا پھر وہ جن اقدار کی علامت تھے، دمشق ان سے مختلف اقدار کی نمائندگی کرتا تھا۔ تاریخ میں اس طرح کا تقابل کوئی دوسرا موجود نہیں۔ اس لئے دمشق سے کھل کر اختلاف کر کے منحرف بننے کی دوسروں کو تو ضرورت تھی، حسینؑ ابن علیؑ کو نہیں۔ جن کی پوری شخصیت شامی حکمرانوں کی حیات، اقدار اور سرگرمیوں کے لئے چیلنج تھی یہ ایک بالکل نادر صورتِ حال تھی اور اس کا تقاضا تھا کہ امامؑ — اتمامِ حجت — کے ڈاکٹرن (اصول) پر بڑی احتیاط کے ساتھ عمل پیرا رہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ دمشق اور خاندانِ اہلِ بیتؑ کے درمیان جو کشیدگی اور تناؤ کی صورتِ حال موجود تھی اسے امام حسینؑ کی واضح منحرفانہ سرگرمیوں نے کشیدہ تر بنا ڈالا۔ برعکس اس کے امامؑ نے اپنی طرف سے بار بار وہ اقدامات کئے جن سے کشیدہ صورتِ حال کے ٹھنڈا کرنے میں مدد مل سکتی تھی لیکن دمشق اندھا دھند راست مقابلے کی طرف آگے بڑھتا رہا تا ایں کہ امامؑ کی امن پسندانہ مساعی نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکیں۔ آپ امام حسینؑ کے اقوال کا جائزہ لیں تو یہ بات خاص طور پر نوٹ کریں گے کہ بالکل اس آخری مرحلے کے علاوہ دمشق نے صورتِ حال کو انقطاعِ کامل کے نقطے پر پہنچا دیا۔ امامؑ نے خود یزید کے فسق و فجور اور ظلم و تعدی کے

بارے میں بھی کچھ کہنے سے حتی الامکان اجتناب برتا ہے اور جو کچھ کہا بھی ہے زیادہ تر بالواسطہ انداز میں، بلاواسطہ طور پر نہیں۔ اس کا سبب ایک تو اس خاندان کا اپنا تہذیبی معیار تھا کہ ناکارہ لوگوں کو بھی ہدف تنقید بنانے سے اجتناب برتا جائے اور دوسرے اس خیال سے بھی کہ کہیں کشیدہ صورتِ حال مزید کشیدہ نہ ہو جائے۔ مدینے کے گورنر نے امامؑ سے جب بیعت کا مطالبہ کیا تو وہ جواب پڑھیئے جو اس موقعے پر امامؑ نے دیا۔ اس جواب میں یزید کی ظالمانہ حرکات اور مجرمانہ کارستانیوں کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے۔ ورنہ کس نے روکا تھا امامؑ کو۔ ان جرائم اور مظالم کی تفصیل بیان کرنے سے جو دمشق کے حکمرانوں نے عام طور پر روا رکھی تھیں۔ امامؑ ایسا کرتے تو بالکل جائز ہوتا اور — کلمہ حق — کہنے کے عام مفہوم سے بھی بات ہم آہنگ رہتی لیکن حسینؑ مسائل کو اخلاق، تہذیبی اقدار — شعور کی پختگی اور بلوغ کی جس سطح پر طے کر رہے تھے وہاں بڑے پاکیزہ ذہنوں کی رسائی ہی ہو سکتی ہے۔ دمشق کے کوڑھ مغز ان نفاستوں کو سمجھنے سے یکسر محروم تھے۔ جن کا امامؑ ہر ہر قدم پر خیال رکھتے تھے۔ گورنر مدینہ ولید کے پاس مروان بھی موجود تھا اور اس نے اشتعال انگیزی سے صورتِ حال کو بگاڑنا بھی چاہا تاہم امامؑ نے مروان اور اموی شہزادوں کے جرائم کی داستان پھر بھی نہ دھرائی۔ اس لئے کہ امامؑ لسانی تشدد کے ذریعے کشیدگی میں اضافہ نہ کرنا چاہتے تھے۔

حسینؑ اور انا

تاریخ کے ان واقعات کا تسلسل جن کا اختتام واقعہ کربلا پر ہوا امامؑ کی طرف سے سکوت، برداشت، امن پسندی اور مصالحت جوئی اور دمشق کی طرف سے مسلسل اشتعال انگیزیوں سے عبارت رہا۔ حسینؑ نے اپنے اقدامات سے ہی نہیں اپنی تقریروں، گفتگوؤں

سے بھی دمشق کے حکمرانوں کو یہ عذر مہیا کرنے کا موقع نہیں دیا کہ حسینؑ ابن علیؑ کا وجود حکومت کیلئے سیاسی رسک کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ یزید کے تخت پر بیٹھنے تک کوئی دس سال کی طویل مدت گزری جس میں مطالبہ بیعت کی سات سال کی مدت بھی شامل ہے۔ اس میں امامؑ کے طرزِ عمل کا جائزہ لے کر — شام کے حکمران معاویہ نے فیصلہ یہ دیا کہ امام حسینؑ سیاسی رسک کی حیثیت نہیں رکھتے۔ دیکھئے اس تمام مدت میں اور یزید کے دور میں بھی امام حسینؑ کا جو موقف رہا وہ یہ تھا کہ حسینؑ مدعی خلافت نہیں تھے۔ منکرِ بیعت تھے۔ مدعی خلافت ہوتے تو مطلب اس کا یہ نکلتا کہ حسینؑ دمشق کی حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ سامنے رکھتے ہیں یعنی مطلب یہ بھی کہ وہ حکومت کے لئے سیاسی رسک ہوتے اور یہ بھی کہ ایک سیاسی تحریک کی کامیابی اور ناکامی سے ان کی انا وابستہ ہو جاتی۔ جس کی کامیابی کے جذبات اور مفاداتِ ذاتی کے لئے مفید اور شکست مضر ہوتی اور یوں ان کی اپنی انا اس تحریک کے مستقبل سے جڑ جاتی جبکہ منکرِ بیعت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حسینؑ کا اختلاف صرف اور محض اصولی تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ حسینؑ کے یہاں تو انا کا عنصر بیعت کے حق میں جاتا تھا۔ جبکہ اصولِ بیعت سے انکار کی سمت میں تھا، آپ غور سے جائزہ لیں تو — ان دونوں موقعوں — مدعی خلافت اور منکرِ بیعت میں زمین — آسمان کا فرق ہے۔ مدعی خلافت ہونے کی صورت میں — انا — کا عنصر ایک منزل کے حصول سے وابستہ ہوتا ہے۔ جب کہ — منکرِ بیعت — ہونے کے موقف میں — انا — بیعت — کے حق میں جاتی ہے اس لئے کہ — بیعت — سے انکار جان کو جوکھوں میں ڈالنے کا باعث بنتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حسینؑ مدعی خلافت ہوتے تو بھی اصول ان کے موقف کے ساتھ موجود رہتا۔ گویا اس صورت میں — انا جمع اصول — کی شکل سامنے آتی جب کہ منکرِ بیعت — کے موقف

میں — اصول نفی انا — کی صورت پیدا ہوگئی بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر یوں کہیے کہ — پہلی صوت میں انا اصول نوازی کا ساتھ دیتی جبکہ دوسری صورت میں اصول نوازی کی راہ اختیار کرنے میں — انا — کا مطالبہ مخالفانہ سمت میں ہوتا — انا — تحفظِ ذات کا تقاضا کرتی جبکہ بیعت سے انکار جان کو خطرے میں ڈالنے کا موجب تھا۔ اس لئے انکارِ بیعت کا فیصلہ کرتے وقت اور اس فیصلے پر جمے رہنے کی صورت میں ہر لمحہ — انا — کے مطالبات اور تقاضوں سے بھی لڑنا پڑتا تھا اور یہ صورت واضح طور پر سابقہ صورت حال سے بالکل مختلف ہے۔

تحریکِ انقلاب چلانے والے ہمیشہ اس یقین کے ساتھ میدان میں آتے ہیں کہ تاریخ ان کے ساتھ ہے اور یوں کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ عبداللہ ابن زبیر نے جب اعلان خلافت کیا تو انہیں یقین تھا کہ حالات ان کے لئے سازگار ہیں۔ اگر شکست کا یقین ہوتا — یقین نہیں قوی امکان بھی ہوتا تو حسب سابق خاموش رہتے۔ جب کہ بیعت سے انکار کرنے والے حسینؑ کو شروع سے شکست اور ہار کا یقین تھا۔ بالفاظِ دیگر شہادت کا یقین تھا جو اپنے حقیقی مفہوم میں شکست نہیں ہے فتح ہے تاہم مادی نقطہ نظر سے تو ہار ہی ہے۔ حسینؑ نے یہ موقف اختیار کرتے ہی کہ وہ منکرِ بیعت ہیں مدعی خلافت نہیں شہید ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک انکارِ بیعت کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں اور نہیں تو اپنی جان قربان کر دیں گے۔ یوں ان کے موقف کی اپنی نوعیت کے پیش نظر مادی کامیابی کا امکان مفقود تھا۔ موقف حصول خلافت ہوتا تو بااقتدار خلیفہ بن جانے کا امکان ہر وقت موجود رہتا۔

تمام مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کے بانیوں کے سامنے کامیابی کا یہ امکان موجود

رہتا ہے اور اس لئے اصولوں کے ساتھ انا کا عنصر بھی پس منظر میں موجود ہوتا ہے لیکن ایک اس موقف میں جہاں معاشرے میں انقلاب لانے کا عظیم مقصد معروضی سوشیالوجیائی حالات کی بنا پر ممکن نہ ہو اور اس لئے اپنے ضمیر کو جرائم کی حمایت یعنی بیعت سے بچانے کا مقصود سامنے ہو تو انا کا عنصر اصول کے ساتھ موجود نہیں ہوتا اور بات ابتدا ہی سے شہادت کی منطق سے وابستہ ہو جاتی ہے یوں حسینؑ کی قربانی اور عام اصلاحی تحریکیں چلانے والوں کی قربانی ہیں فرق ہے اور یہ فرق موقف کی خالص اصولی نوعیت سے پیدا ہوتا ہے۔

حسینؑ اور سقراط

اسی طرح حسینؑ اور سقراط کی قربانی میں بھی جوہری فرق ہے اور یہ فرق اتنا واضح ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سقراط کے سامنے کوئی انتخاب یا چوائس موجود نہیں تھی۔ ایتھنز کی عدالت نے سقراط سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ نوجوانوں کے ذہنوں کو جلا دینے کی اپنی تحریک واپس لے لے تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر سقراط سے بیعت کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ سزا اس کے سابق جرائم — نام نہاد جرائم — پر دی گئی تھی — ماضی کی سرگرمیوں پر دی گئی تھی مستقبل کی کسی یقین دہانی سے انکار کی بنا پر نہیں۔ یہ صحیح کہ اس نے رشوت دے کر رہائی حاصل کرنے کے مشورے پر اپنے شاگرد کو ڈانٹ دیا تھا لیکن کیا آپ سقراط جیسے عظیم شخص سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی گلوخلاصی کیلئے رشوت دینا پسند کرے گا۔

حسینؑ کے سامنے سقراط کے مقابل صورت حال مختلف تھی۔ ان کے پاس چوائس انتخاب موجود تھا۔ ایک طرف بیعت تھی اور دوسری طرف صرف اپنی جان کی قربانی ہی نہیں بہتر دوسرے افراد کی شہادت پورے خاندان کی بربادی، بھیانک مظالم اور بربریت آمیز

دوسری جنگِ عظیم سے بعد کے کئی مرثیہ نگاروں کا ذہنی ماحول زندگی کا نئی جہتوں کے اس ادراک کا پس منظر رکھتا ہے۔اب کربلا صرف مصائب کی داستان سے عبارت نہیں ہے۔ جو ابتدائی عہد کے مرثیوں، نوحوں اور سلاموں کی خاص پہچان تھی۔ المیۂ کربلا کے جو پہلے ردِعمل آئے وہ عموماً اسی سوچ کے حامل تھے۔ جبکہ دوسری منزل پر ادراک کی گہرائی اس سطح پر پہنچی کہ کربلا مظلومیت کی ایک ہمہ گیر علامت کے طور پر ابھری اور تازہ تر ردِعمل نے 61ھ کے پہلے عشرے کے حوادث کی ان پہنائیوں کے ادراک کی کوکھ سے جنم لیا ہے جو کربلا کو نہ صرف مظلومیت بلکہ اخلاقی اور تہذیبی قدروں کا آئیڈیل قرار دیتا ہے۔ ایک ایسا آئیڈیل جو پورے انسانی معاشرے کی جہتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ نیا دور اکیسویں صدی میں زیادہ پُر معنی اور ہمہ گیر سمتوں پر مشتمل ہے ہر چند سلام اور نوحے اپنی تشکیلی محدودات کی بناء پر عموماً پہلے دور کے ردِعمل کے ترجمان ہیں لیکن مرثیے کی ساخت اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ کربلا جو اساسی طور پر آنحضرتؐ اور ان کی آل جس کلچرل سنتھیسس ۔ تہذیبی مرکبے کی نمائندگی کرتی ہے اس کی تمام جہتوں کو اپنے دائرے میں سمو لے۔ مرثیے کا نیا دور اسی رخ کی نمائندگی کر رہا ہے۔ ہر چند اکیسویں صدی میں ادراک کے مزید بلوغ کے ساتھ نئی جہتوں کے ادراک مختلف ابعاد میں گہرائی اور گیرائی حاصل کرے گا اور یوں انسانی معاشرہ اپنی سمتوں کو زیادہ معروضی (آبجیکٹیو) بنانے میں کامیاب ہوگا تاہم ہمارے موجودہ دور کے شعراء کو یہ اعزاز حاصل رہے گا کہ انہوں نے اس وسیع تناظر کو سمجھنے کی سعی کی جسے کربلا کا المیہ واقعی محیط ہے۔

یہ وسیع تناظر صرف کسی ایک انسانی ردِعمل سے تعلق نہیں رکھتا اس کے دائرے میں پورا انسانی شعور، کائنات کی حقیقتوں کا گہرا ادراک، اخلاقی اقدار کے تعین کی صحیح نوعیت،

زیادتیاں حسینؑ کو دو متبادل صورتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ انتخاب کرنے کا حق ان کے پاس تھا۔ سقراط کے پاس نہیں۔ سقراط کو کسی کا فیصلہ سننا تھا اور حسینؑ کو اپنا فیصلہ سنانا تھا جو انہوں نے سنا دیا۔ سقراط کے پاس صرف رشوت دینے کی چوائس تھی۔ رشوت دینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے سارے ماضی پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا جیسا کہ اس نے اپنے شاگرد سے کہا بھی تھا۔ عدالت کے فیصلے کو بدلنے کا اختیار اس کے پاس نہیں تھا۔ حسینؑ کے پاس حکمران کا فیصلہ بدلنے کا چوائس موجود تھا۔ ان کے حق میں جو فیصلہ ہو رہا تھا وہ بیعت سے وابستہ تھا۔ بیعت کر لیتے تو وہ خود اور ان کے رفقاء لرزہ خیز مظالم سے بچ سکتے تھے۔

حسینؑ اور سقراط کی قربانی میں ایک اور بڑا فرق یہ بھی ہے کہ حسینؑ چاہتے تو دس محرم کی رات کی تاریکی میں بیعت اور موت دونوں سے بچ جاتے۔ انہوں نے رفقاء سے کہا تھا کہ وہ رات کی تاریکی میں کہیں چلے جائیں۔ سخت قدغنوں اور نگرانیوں کے باوجود یہ ممکن تھا کہ حسینؑ بھی رات کی تاریکی میں روپوش ہو جاتے۔ اگر ان کے رفقاء کے لئے بچ جانے کا امکان موجود تھا تو ان کے لئے بھی یہ راستہ اختیار کرنا ممکن تھا یا کم سے کم وہ یہ کوشش ضرور کر سکتے تھے۔ سقراط کے لئے بچ نکلنا ممکن تھا تو صرف رشوت دے کر مگر حسینؑ رشوت دیئے بغیر بچ سکتے تھے یوں ہوتا تو حسینؑ کی اپنی جان تو بچ جاتی مگر وہ اصول کیا وہ اصول ذبح نہ ہو جاتا جس کیلئے حسینؑ نے جان دی، لازماً ذبح نہ ہوتا جس کے لئے حسینؑ نے جان دی، اس لئے کہ اس صورت میں بھی بیعت تو وہ نہ کرتے۔ ہاں بالکل اعلیٰ اخلاقی اقدار کے پیمانے پر اس طرح موت سے بچ نکلنا خوف کی نمائندگی ضرور کرتا اور خوف کی وجہ سے موت سے ڈرنے والا اعلیٰ عظمتوں کا استحقاق نہیں رکھتا۔ حسینؑ یہ کچھ کرتے تو تاریخ اخلاقی اقدار کی اس بے مثال علامت سے محروم رہ جاتی جس کا نام — حسینؑ ابن علیؑ — ہے۔ حسینؑ کی

کربلا کے المیے اور ایتھنز کی عدالت کے مجرم سقراط کے المیے میں اور بھی بنیادی فرق اور اساسی امتیازات ملتے ہیں۔ سقراط کے خاندان کی عورتیں جب بھی حراست خانے میں ملنے آتیں تو شدید جزع وفزع کے ذریعے سقراط کو زہر کھانے سے باز رہنے پر مجبور کرتیں۔ اس صورتِ حال سے عاجز آ کر سقراط نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ خواتین کو واپس کر دیں اور آئندہ انہیں حراست گاہ میں نہ آنے دیں۔

حسینؑ کے المیے میں صورتِ حال اس سے مختلف تھی۔ کربلا میں خواتین اور بچوں کی گریہ وزاری کی آوازیں بلند ہوتی تھیں مگر یہ سب کچھ صرف صورتِ حال کی اپنی نوعیت کا ردعمل تھا ورنہ حسینؑ کے قافلے میں سب ہی بیعت کے معاملے میں یکساں موقف رکھتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ امام کی چار سالہ لڑکی سکینہ نے جب پیاس کی شدت کی شکایت کی تو امامؑ نے نیزے سے زمین کھود کر کچھ پانی برآمد کیا۔ سکینہ پانی پینا ہی چاہتی تھیں کہ باپ نے روکا اور کہا — سکینہ تم جانتی ہو اس پانی کی قیمت کیا ہے؟ اس پانی کی قیمت یزید کی بیعت ہے۔ راوی کہتے ہیں۔ سکینہ نے یہ پانی پھینک دیا اور کہا کہ — اس قیمت پر یہ پانی بہت مہنگا ہے۔

اس ضمن میں روایت کی صحت پر دماغ نہ کھپایئے۔ سوچیئے یہ کہ کربلا کے المیے سے کس قسم کی روایات وابستہ ہیں۔ واقعہ اپنی نوعیت اور اطلاعات میں جو معنویت رکھتا ہے اسی کی نسبت سے اس سے متعلق روایات موجود ہوتی ہیں جن میں سے بعض غلط بھی ہوتی ہیں جن سے جذبہ عقیدت پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے، مگر جذبہ عقیدت کے زیرِ اثر جو روایات وجود میں آتی ہیں وہ بھی تو اس رجحان کے تحت ہی ہوتی ہیں جو متعلقہ واقعہ میں پایا جاتا ہے۔ کربلا کے المیے کی اپنی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس جیسی روایات موجود ہوں جو

اصول کے نکھراپن کی وضاحت کرتی رہیں۔

سقراط کی حسینؑ سے مشابہت اس نقطے پر آکر ختم ہو جاتی ہے بلکہ کربلا اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ہے۔ پانی کی بندش، فرات کے پانی پر قبضہ کے ایشو کو جنگ اور تصادم کا عنوان بنانے سے امامؑ کا اجتناب، بہتر افراد کی شہادت، نعشوں کی بے حرمتی، خیموں کا جلایا جانا۔ خاندانِ اہل بیتؑ کی اسیری اور بازاروں میں تشہیر وغیرہ المناک حوادث کا وہ دردانگیز سلسلہ ہے جو صرف سانحہ کربلا میں ایک جگہ جمع ہوگیا ہے اور دوسری ایسی اصولی جدوجہد میں کہیں نظر نہیں آتا جو انتخاب وچوائس کے ساتھ کی گئی ہو یعنی جس میں قربانی دینے نہ دینے کی چوائس قربانی پیش کرنے والے کے پاس موجود ہو۔ یہ صورتِ حال صرف حسینؑ اور ان کی کربلا کے ساتھ مخصوص ہے یہ تاریخ کے کسی اور المیے میں نظر نہیں آتی۔

مظلومیت اور اصول

تاریخ کے المیہ ڈراموں کے وہ مظلوم ہیرو جنہوں نے اصولوں کی خاطر موت کو قبول کیا ہمیشہ انسانوں کی مقبول شخصیتیں رہے ہیں۔ افراد سے انسانوں کی یہ محبت خود افراد سے متعلق نہیں ہوتی — اصولوں — سے وابستہ ہوتی ہے اور یہ محبت زیادہ گہری، زیادہ عمیق ہو جاتی ہے۔ جب اصولوں سے مظلومیت بھی نتھی ہو — اصول نواز فاتح بھی عوامی مقبولیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن یارانِ محفل۔ یہاں ذرا رک جایئے۔ کہیں کوئی غلط بات تو قلم سے نہیں نکل گئی۔ اس لئے کہ بعض لوگ تو اس رائے پر پہنچے ہیں کہ انسان سب کچھ معاف کرسکتے ہیں مگر فتح جسے لوگ بہ مشکل ہی معاف کرتے ہیں۔ جنگی فتوحات ہی نہیں انسان تو عام کامیابیوں کو بھی معاف کرنے یا برداشت کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیتے

رہے ہیں۔

تاریخِ انسانی ایک کھلی کتاب کی طرح حسینؑ کے سامنے تھی اور اس لئے انہوں نے تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی تو شکست کے راستے جو مقبول بنانے کا سب سے موثر راستہ ہوتا ہے۔ حسینؑ نے اپنے لئے مظلومیت کا بدل چنا جو افراد کو محبوب بنانے کا سب سے یقینی ذریعہ بنتی رہی ہے۔ پھر اگر یہ مظلومیت اصولوں کے لئے ہو تو مقبولیت و محبوبیت قدم چومتی ہے۔ اصولوں کے لئے ہار جانے والے ہمیشہ مقبول رہے ہیں اور یہ ہار موت تک پہنچ جائے تو پھر عوامی محبت کچھ زیادہ ہی عمق و گہرائی پیدا کر لیتی ہے۔ مظلومیت ایک وسیع تر اصطلاح ہے اور اس لئے کئی درجوں میں بٹ جاتی ہے۔ عوامی محبت اور لگاؤ ان درجوں کی نسبت سے گھٹتا بڑھتا ہے۔ مظلومیت کے جن درجوں تک کوئی ہیرو پہنچ جاتا ہے مظلومیت ہی کی طرح اصولوں کا معاملہ ہے بعض ہیرو مقاصد کے تعین میں اصول نواز ہوتے ہیں مگر وسائل کے انتخاب میں آزادی محسوس کرتے ہیں۔ بعض وسائل کے بارے میں بھی احتیاط پیش نظر رکھتے ہیں مگر کبھی کبھی مجبور کن حالت کی وجہ سے اس احتیاط کا دامن چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ اب اگر مظلومیت اور اصول نوازی اور وسائل کے انتخاب میں شدت احتیاط ساتھ ساتھ ہوں تو متعلقہ المیہ اور اس کا ہیرو تاریخ پر انتہائی گہرا اور دیرپا اثر ڈالتا رہے گا۔

حسینؑ اور ان کی کربلا اس قسم کے المیے کی واحد مثال ہے، اور اس لئے کہ کربلا کا اثر تاریخ پر دوسرے کسی بھی واقعے سے بہتر، زیادہ گہرا، بہت زیادہ دور رس ثابت ہوا۔ حسینؑ دراصل علامت بن گئے ہیں، اصول نوازی اور مظلومیت کی۔ وسائل کے استعمال میں شدید احتیاط اور کردار کی پختگی اور بلوغ کی اور اس لئے حسینؑ سے محبت کسی خاندانی رشتے کی بنا پر نہیں ہے۔ یہ مسئلہ نسلی نہیں ہے بلکہ اصولوں اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے محبت کا

مسئلہ ہے اور اس لئے حسینؑ کے غم میں جو آنسو بہائے جاتے ہیں وہ دراصل اعلیٰ تہذیبی و اخلاقی اقدار سے محبت کے جذبے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ حسینؑ اخلاقی اقدار کے مجسمے کی حیثیت حاصل کر گئے ہیں۔ ہر شخص کسی زمانی و مکانی حد بندی میں پیدا ہوتا ہے۔ حسینؑ بھی ایک متعین زمانی و مکانی رشتے میں تاریخ کے اسٹیج پر نمودار ہوئے لیکن وہ مجموعۂ انسانی تہذیب کی ملکیت ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان قدروں کی علامت ہیں جو تہذیبِ انسانی کو سب سے زیادہ عزیز رہی ہیں۔ کربلا کے واقعے کو اس روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ مشہور مورخ ایڈورڈ گبن نے اپنی کلاسیکی کتاب۔ تاریخِ زوال وسقوطِ سلطنتِ رومہ — میں بالکل صحیح کہا کہ — "حسینؑ کے واقعے کو کسی بھی عہد، کسی بھی زمانے کے سنگدل سے سنگدل انسان کو سنایا جائے تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں گی۔" اس لئے کہ حسینؑ کسی ایک عہد کے آدمی نہیں ہیں۔ حسینؑ کسی ایک دور کی شخصیت نہیں۔ حسینؑ پوری تاریخِ تہذیب کا سرمایہ ہیں۔ حسینؑ تاریخِ نسلِ انسانی کا حسن اور نکھار ہیں۔ زردشت نے کربلا سے کوئی تیرہ صدیوں پہلے کہا تھا کہ میں ان لوگوں کو سلام کرتا ہوں جنہوں نے سچائی کے لئے جان دی، آج بھی جان دے رہے ہیں اور مستقبل میں بھی دیتے رہیں گے۔

زردشت کا یہ سلام سقراط سے ہوتا ہوا حسینؑ تک پہنچ گیا اور ان لوگوں تک پہنچتا رہے گا جو حسینؑ کی تقلید کرتے رہیں گے۔

مصنف کے بارے میں

(1999-1917)

سید محمد تقی ۳ مئی ۱۹۱۷ء میں دوآبۂ گنگ و جمن کے مردم خیز اور دلفریب قصبے امروہہ میں پیدا ہوئے۔ یہ بستی دہلی سے اسی میل مشرق میں اور لکھنؤ سے تین سو میل مغرب میں واقع ہے۔ جدِ اعلیٰ کا نام سید حسین شرف الدین تھا جنہیں اب تک شاہ ولایت کہتے ہیں۔ وہاں شاعری، نثر اور تاریخ دانی کی روایت کئی پشتوں سے چلی آ رہی تھی۔ سید محمد تقی کے والد علامہ شفیق حسن ایلیا، شاعر، ادیب، مورخ اور علمِ ہیت کے محقق تھے۔ وہ فارسی، انگریزی، ہندی، سنسکرت اور عبرانی زبانوں کے عالم تھے۔ انہوں نے ان زبانوں میں شاعری کی اردو اور عربی فارسی میں نثر بھی لکھی۔ ان کا رجحان فلسفے کی طرف بھی تھا۔ سید محمد تقی نے یہ رجحان ان ہی سے لیا۔

سید محمد تقی نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر کے مردان خانے کے مکتب میں حاصل کی۔ ان کے دادا نے یہ مکتب اپنے پوتوں رئیس امروہوی، کمال امروہوی، ذیشان حیدر اور سید محمد تقی کے لئے قائم کیا تھا جہاں دو معلم ان بچوں کو اردو، فارسی، عربی کے ساتھ ساتھ بنیادی مذہبی تعلیم، قرآن و حدیث کی تعلیم اور فارسی و عربی کی کلاسیکی ادبیات بھی پڑھاتے تھے۔ اس مردان خانے کی دوسری تعلیمی حیثیت یہ تھی کہ اس میں صبح سے شام تک بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس میں صرف آفاقی مسائل ہی زیرِ بحث رہتے۔

سید محمد تقی نے ۱۹۳۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی کا امتحان دیا جو میٹرک کے مساوی سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں الٰہ آباد کا سب سے بڑا ادب کا امتحان فاضلِ ادب پاس کیا۔ جس میں اردو نثر، نظم، بلاغت، تاریخ وغیرہ مضامین شامل تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء

میں امروہہ کے ایک اسکول ''سید المدارس'' سے جو الٰہ آباد بورڈ سے وابستہ تھا مولوی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی عالم کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا جس میں فلسفہ، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، تاریخ وغیرہ شامل تھے۔ یہ امتحان عربی میں لئے جاتے تھے۔ مولوی عالم اور مولوی فاضل کا امتحان عموماً ۲،۲ سال کی مدت میں دیا جاتا تھا لیکن سید محمد تقی نے یہ امتحان ایک ایک سال میں دیئے اور بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ پھر ۱۹۳۷ء میں بی اے پاس کیا۔

جوانی میں سید محمد تقی شاعری بھی کرتے تھے اور ''صدر'' تخلص رکھتے تھے۔ انہوں نے قرآن بھی حفظ کیا تھا اور حافظِ قرآن کہلاتے تھے۔ پھر اس کے بعد ان کی دلچسپی فلسفہ اور اس کے مختلف موضوعات میں بڑھ گئی اور کچھ عرصے ہی میں وہ وطن پرست کمیونسٹ ہو گئے اور صرف کھدر پہننے لگے۔ ان کا رجحان کانگریس کی طرف ہو گیا اور کانگریس کے باقاعدہ ممبر بن گئے۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک وہ کانگریس میں شامل رہے۔ ۱۹۴۰ء میں وہ مسلم لیگ میں بطور رضا کار شامل ہوئے اور ایک کتابچہ لکھا ''پاکستان اسٹالن کی نظر میں'' وہ مختلف رسالوں اور روزناموں میں مضامین بھی لکھتے تھے۔ وہ امروہہ سے دہلی منتقل ہو گئے۔ وہاں روزنامہ ''جنگ'' دہلی اور ماہنامہ ''شمع'' دہلی سے متعلق ہو گئے۔ اس وقت جنگ کے منتظمین کا یہ خیال تھا کہ اخبار دہلی اور کراچی سے بیک وقت شائع ہوگا۔ جنگ کراچی کی اوارت رئیس امروہوی کریں گے کیونکہ وہ ۱۹۴۷ء ہی میں پاکستان آ گئے تھے اور ''جنگ'' دہلی کی ادارت کے فرائض سید محمد تقی انجام دیں گے۔ لیکن جنگ پھر صرف کراچی ہی سے شائع ہونے لگا۔ ۱۹۴۸ء میں جب سید محمد تقی پاکستان آئے تو پھر جنگ کی ادارت کی ذمہ داری ان کو سونپ دی گئی اور ۱۹۶۹ء تک وہ ان فرائض کو بخیر وخوبی انجام دیتے رہے۔ انہوں نے ۱۹۵۰ء سے ہی فلسفے کے موضوعات پر جنگ میں ہفتہ واری مضامین لکھنے شروع کر دئے تھے۔

سید محمد تقی مشرقی اور مغربی کلاسیکی فلسفے سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ایک ہی نشست میں بوعلی سینا، افلاطون، ارسطو، برٹرینڈ رسل، وٹ گنشٹائن اور قرآن وحدیث کی

کتابوں کے حوالے دیتے تھے اور کتاب کے متعلقہ صفحات بھی بتاتے چلتے تھے۔ یہ اس مسلسل ریاضت کا ثمر تھا جس سے انہوں نے تاریخ انسانی کے ہر دور کی فکری اساس کو سمجھنے کی سعی کی تھی۔ انہوں نے اپنی کتاب ''منطق، فلسفہ اور سائنس'' کے ابتدائیے میں لکھا ہے کہ ''میں کسی مفکر کو اپنا رہنما ماننے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس لئے کہ میں نے ہر فلسفی کو اپنے ذہنی پیمانوں سے ناپا اور اپنے فکر کی کسوٹی پر جانچا ہے۔ اس لئے میں کسی ایک فلسفی یا کسی ایک مدرسہ فکر سے پوری طرح مس ہونے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ میری سوچ نے بڑی سنگین ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کئی معقول اور معلوم نظریوں کو میں نے اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جب تک ان کی صحت کے حق میں ناقابل تردید دلائل نہ مل سکے۔ میں سند (اتھارٹی) پرستی کے رجحان سے مفاہمت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔'' سقراط کی اس رائے سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ —— ''جو زندگی تخلیق اور تجسس سے خالی ہو وہ گزارنے کے قابل نہیں ہوتی۔''

وہ اپنے مستقل مطالعہ کی بنا پر دورِ جدید کے فکری رجحانات سے بھی واقف رہتے تھے۔ وہ ایک پاکستانی فلسفی، دانشور، ادیب اور تجربہ کار صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مشرق اور مغرب کے ہم عصروں میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے تاریخ، علمیات، علم سماویات اور الوہیت کے بارے میں ایک جامع اور مربوط نظام پیش کیا۔ اردو میں لکھنے والے وہ پہلے صاحبِ نظام فلسفی تھے جنہوں نے کائنات کا ایک جامع، متوازن، اندرونی طور پر مضبوط، واضح اور مربوط نظام پیش کیا۔ جو شعورِ محض ارتکازات و توانائی اور تاریخ کے کمانی نظریئے پر مبنی ہے۔ ان کی بنیادی قدروں میں علم سے محبت، عقلیت پسندی، جمہوریت، فکر و عمل کی ہمدردی، رواداری، آزادی تحریر و تقریر غرض بائیں بازو کی تمام قدریں شامل تھیں۔

ان کی تصانیف کا دائرہ معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، الٰہیات، دستوری نظام، تنقید اور فلسفے کے تقریباً تمام موضوعات پر مشتمل ہے۔ سید محمد تقی نے صحافی کی حیثیت سے بہت سے ملکوں کے دورے کئے اور پاکستان کی نمائندگی کی۔ مصر، عراق، ترکی، اٹلی،

برطانیہ، ہندوستان اور ایران وغیرہ۔ اس کے علاوہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں فلسفہ کانگریسوں میں شرکت کی اور مقالے پڑھے۔ پاکستان میں بھی فلسفہ کانگریس میں شرکت کرتے اور مقالے پڑھتے تھے۔ میکسکو میں ۱۹۸۲ء کی عالمی فلسفہ کانگریس کے پہلے اجلاس کی صدارت کی اور کلیدی مقالہ پڑھا۔ کتابوں کی تصانیف کے علاوہ انہوں نے بہت سی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ ان کا خیال تھا کہ قدیم یونانی اور لاطینی تصانیف اور تمام امہات الکتب کا اردو میں ترجمہ ہونا چاہئے۔ انہوں نے کارل مارکس کی ''داس کیپٹال'' کی جلد اوّل اور ثانی اور وائٹ ہیڈ کی ''مقاصدِ تعلیم'' وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ ایسی کتابیں جن کا عالمی تاریخ پر بہت گہرا اثر ہے۔ انہوں نے آدم جی ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

سید محمد تقی، رئیس امروہوی، محمد عباس اور جون ایلیا چاروں بھائی بہت لمبے عرصے ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ایک ایسے گھر میں جس کے لان پر قومی اور بین الاقوامی تقریباً تمام شخصیات جن میں شعراء ادیب، تنقید نگار، صحافی، سیاسی رہنما، علماء (تمام فرقوں کے) سماجی رہنما اور کارکن، حکیم و ڈاکٹر، دانشور، مزدور لیڈر، یونیورسٹیوں کے پروفیسرز، طلباء، بیوروکریسی اور بنکوں کے افسران، اقلیتی اداروں کی تنظیموں کے صدور اور کارکن، مختلف ممالک کے سفارتی نمائندے اور نہ جانے کتنے لوگ جنہیں علمی شوق تھا اس لان پر روزانہ جمع ہوتے تھے۔ یہ اجتماع روز کا معمول تھا اور کبھی بھی کسی بھی وجہ سے یہ روز کا معمول بدلتا نہیں تھا۔ یہاں دنیا کے ہر موضوع پر دھواں دار بحثیں ہوتی تھیں۔ ملک میں جو بھی تحریک چل رہی ہوتی اس پر سیر حاصل گفتگو مشورے اور حل بحثوں کا موضوع ہوتا تھا اور ہر شخص کو اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کی پوری طرح اجازت تھی۔ ہر فرد کی بات پورے انہماک اور توجہ سے سنی جاتی تھی اور مخالفت بھی کھل کر کی جاتی تھی۔ شہر کے بہت سے لوگ اس لان کو کراچی کا ''ہائیڈ پارک'' کہتے تھے۔ اس گھر کے دروازے ہر شخص کے لئے رات گئے تک کھلے رہتے تھے۔ کسی آنے جانے والے کو کسی شبے کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا چاہے وہ کتنا ہی اجنبی کیوں نہ ہو۔

سید محمد تقی کی یہ کتاب ''کربلا — تہذیب کا مستقبل'' ۱۹۸۰ء میں تحریر کی گئی تھی۔ وہ اسکو خود چھپوانا چاہتے تھے لیکن خانۂ فرہنگ ایران نے اسکی طباعت کرانے کی پیشکش کی جسے انہوں نے قبول کرلیا اور کتاب کا مسودہ انہیں دے دیا۔ نمعلوم کس طرح خانۂ فرہنگ ایران والوں سے یہ کتاب کھوگئی۔ پھر اسکا اصلی مسودہ بھی نہ مل سکا۔ آخری عمر میں ان کی یادداشت بھی اتنی اچھی نہ رہی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد نے ان کے کاغذات سے یہ کتاب ڈھونڈ نکالی۔ پھر اسکا مسودہ جناب ڈاکٹر حسین محمد جعفری، مفسّر قرآن جناب مولانا محمد حسن اور جناب ڈاکٹر محمد رضا کاظمی کو یہ مسودہ پڑھنے کے لئے دیا تاکہ ان کی قیمتی آراء کی مدد سے اسکی اشاعت کا بیڑا اٹھایا جاسکے۔ ہم سب بہن بھائی ان سب کے تہہ دل سے شکر گذار ہیں کہ ان لوگوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر اس مسودے کو پڑھا اور اسکی جلد اشاعت پر زور دیا۔ جناب ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے بھی ہم چاروں بہن بھائی بہت زیادہ شکر گذار ہیں کہ انہوں نے نہ صرف اس مسودے کو پڑھا بلکہ اسکی اشاعت میں بھی ہماری مدد کی۔ ان ہی کے کہنے پر جناب آغا امیر حسین نے اسکی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ ہم سب بہن بھائی حمورابی تقی، حیدر تقی، شہناز سعید اور میں شائستہ سعید آغا صاحب کے بہت شکر گذار ہیں۔

اس کتاب میں کربلا کے المیے کو بہت سے مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ کربلا کے المیئے کو نسلی مسئلہ کے بجائے اصولوں اور اخلاقی اقدار کا مسئلہ قرار دیا گیا ہے۔ کربلا تاریخ تہذیب کا سرمایہ اور سچائی کے لئے جانیں دینے کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین کو اس کتاب سے بہت سے نئے زاویوں اور فکر کے اس انداز سے کربلا کے بارے میں سوچنے کا موقعہ فراہم ہوگا۔

شائستہ سعید

غرض، تہذیبی، زندگی کی ساری پہنائیاں آجاتی ہیں۔اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کربلا صرف انسانی مصائب کی دردناک علامت کی حیثیت نہیں رکھتی ہے بلکہ یہ محمدؐ وآلِ محمدؐ کی زندگی، حیات، پیغام، سوچ اور مشن کی تمام جہات کے مجموعے اور خلاصے کی حیثیت بھی رکھتی ہے لیکن یہ بات یوں کہنے کو تو چند لفظوں میں کہہ دی گئی ہے جبکہ اس میں تو پوری کائنات، بلکہ پورے وجود کی وسعتیں سموگئی ہیں۔

53ھ میں جب یزید کی جانشینی کا اعلان ہوا اور اس کے لئے بیعت لی گئی تو تیسرے خلیفہ کے بیٹے سعید ابنِ عثمان امیرِ شام کے پاس آئے اور انتہائی غصے میں کہا کہ ''آپ نے مجھ پر یزید کو مقدم کیا اور اس کے لئے بیعت لی۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ میرے باپ اس کے باپ سے بہتر، میری ماں اس کی ماں سے اچھی اور میں خود اس سے بہتر ہوں۔ جو کچھ آپ کو ملا ہے یہ میرے باپ کا صدقہ ہے۔'' اس کا قدرے تفصیل کے ساتھ جواب دے کر باپ نے بیٹے کے بارے میں کہا کہ ''یہ بات کہ تم یزید سے بہتر ہو، تو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے نزدیک اگر تم جیسوں سے میرا گھر بھرا ہو تو وہ سب مل کر بھی یزید کے برابر نہ ہوں گے۔''

آپ نے دیکھا باپ کی بیٹے کے بارے میں رائے کیا ہے؟

لیکن اس واقعے کا جو حصہ قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ سعید تو سن کر خاموش ہوگئے، مگر یزید نے باپ کو منایا اور کہا کہ سعید میری وجہ سے کبیدہ خاطر ہوگئے ہیں آپ انہیں کسی طرح سے خوش کر دیجئے۔ چنانچہ باپ نے بیٹے کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے انہیں خراسان کا گورنر مقرر کر دیا۔

آپ نے دیکھا یزید نے ایک اہم شخصیت کی ناراضگی سے سیاسی مصالح کو جو

سید محمد تقی کی تصانیف و تراجم

☆ تصانیف

1۔ منطق فلسفہ اور سائنس

2۔ روح اور فلسفہ

3۔ تاریخ و کائنات میرا نظریہ

4۔ ہندوستان پس منظر و پیش منظر

5۔ نہج البلاغۃ کا تصورِ الوہیت

6۔ Essays in Philosopy

7۔ A New concept of the Universe

(آخری کتاب 850 صفحات لکھنے کے بعد انتقال کیا۔)

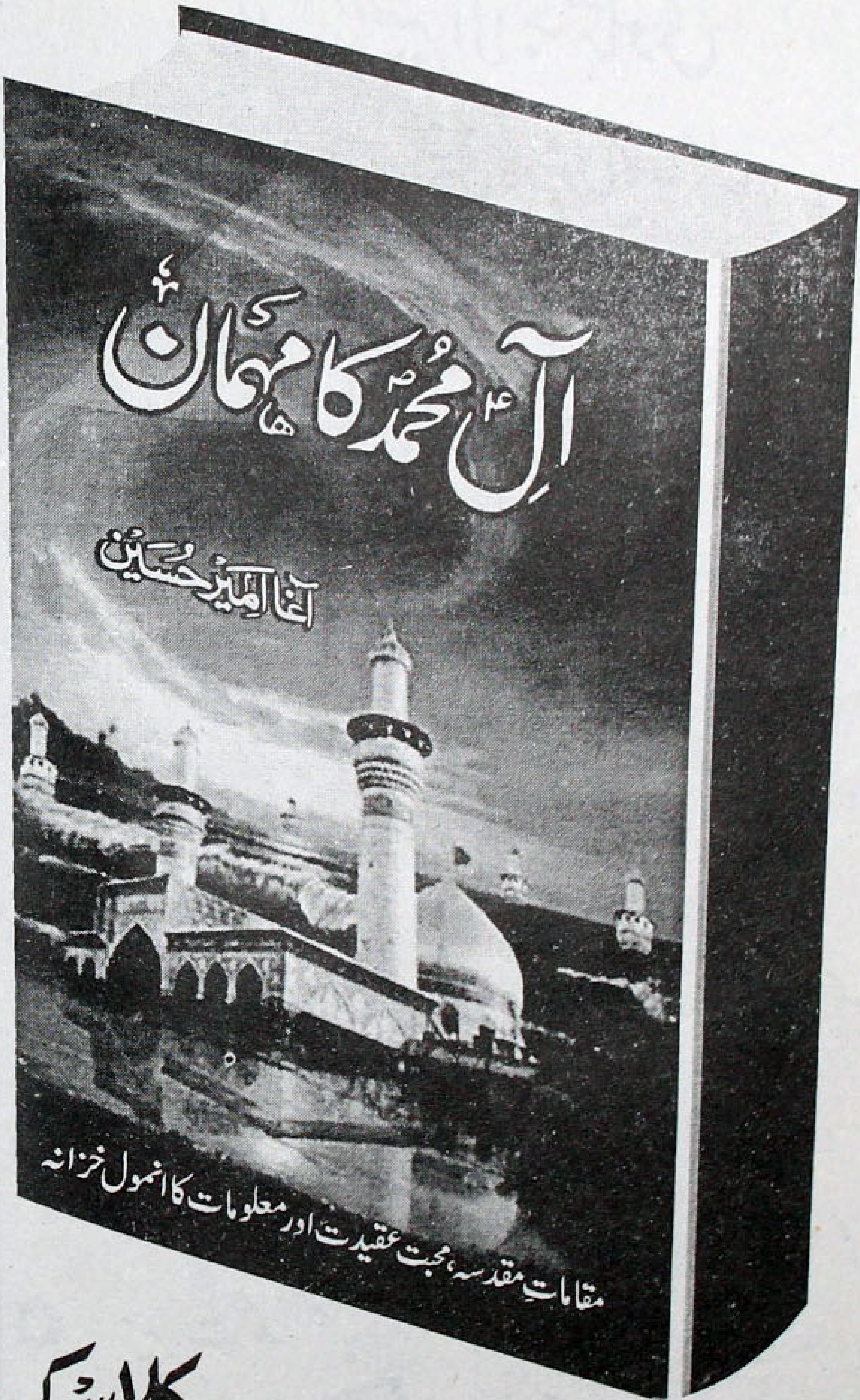
☆ تراجم

1۔ داس کیپٹال (جلد اوّل، جلد ثانی) مصنف کارل مارکس

2۔ مقاصدِ تعلیم، مصنف: وائٹ ہیڈ

3۔ جمہوریت اور تعلیم (حصہ اوّل، حصہ دوم) مصنف: جان ڈوئی

4۔ پراسرار کائنات، مصنف: سر جیمس جینس


آلِ محمدؐ کا مہمان
آغا امیر حسین
مقاماتِ مقدسہ، محبت عقیدت اور معلومات کا انمول خزانہ

نقصان پہنچ سکتا تھا اس کو ٹالنے میں کتنی مؤثر مداخلت کی ''پھر'' اور یہ پھر کافی اہم اور توجہ طلب ہے۔ یہ مشورہ ایک اس شخص نے دیا ہے جس کی بابت یہ تصور پیدا کر دیا گیا ہے کہ وہ صرف اکھڑ، اندھے جذبات اور پُرشور ذہن والا نوجوان ہے۔ جس کے ورثے میں عیاری کا عنصر شامل نہ ہو۔ یہاں تو مروج طرز کا سیاسی مشورہ دیا گیا ہے۔ کیا اس سے یہ رائے قائم نہیں ہوتی کہ واقعہ کربلا کا مجرم یزید اس یزید سے مختلف قسم کی شخصیت تھا جو سعید ابنِ عثمان کے بارے میں سیاسی رشوت دے کر کام نکالنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ بیعت کی طلبی پر سر قلم کر دینے کا حکم اور اپنے چچازاد بھائی ولید گورنر مدینہ کو امام حسینؑ کے صحیح اور سالم چلے جانے دینے پر مدینے کی گورنری سے معزول کر دینے والا یزید، قتل و غارت گری کے علاوہ بھی کام نکالنے کا گر جانتا تھا۔ گویا سیاسی ضرورت کے تقاضے کا معاملہ ہوتا تو بیعت کے مطالبے کو کئی مہینے ٹالا بھی جا سکتا تھا، مگر یہاں تو بات ہی دوسری ہے۔ واقعہ یہ نہیں ہے کہ یزید سیاسی انداز پر کام نکالنے سے ناواقف تھا، اصل صورت حال یہ ہے کہ اسے پیغمبرؐ اور ان کے گھرانے سے نفرت تھی اور اس لئے اس نے مکمل شعوری حالت میں بیعت کا مطالبہ کرنے کا قدم اٹھایا جس میں آخری حد تک جانے کو تیار تھا اور ان تمام خطرات سے آگاہ، جس کا باپ نے ذکر کیا تھا۔ باپ اس کی جانشینی کے لئے جو اقدامات کر رہے تھے اسے لازماً ان کا علم تھا۔ جیسا کہ سعید بن عثمان کے واقعے سے ظاہر ہے۔ قدرتاً اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کن حضرات کو اس کی جانشینی پر شدید اعتراض ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا منطقی ہوگا کہ اسے امام حسینؑ کے بارے میں تمام تفصیلات کا علم تھا تاہم باپ کے حتیٰ الامکان نرمی اور شرافت کا عمل کرنے کے مشورے کو اس نے درخورِ اعتناء قرار نہ دیا تو اس کے صاف معنی یہی ہوں گے وہ اصل بیعت ہی کے بارے میں ایک جانے بوجھے

منصوبے کو سامنے رکھتا تھا۔

اموی ارسٹا کریسی جو عظیم اسلامی حکومت کے وسیع اور عریض علاقے پر اقتدارِ کل رکھتی تھی، ایسے کئی افراد پر مشتمل تھی جو معاویہ ابنِ ابوسفیان کے بعد حکومت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ سعید بن عثمان، ان میں سے ایک تھے اور مروان بن حکم، مروان بھی یزید کی جانشینی پر سخت برافروختہ تھے اور معاویہ ابنِ سفیان کے اس وعدے سے ہی مطمئن ہو سکے کہ یزید کے بعد حکومت ان ہی کو ملے گی۔ یہ وعدہ وقتی ضرورت پوری کرنے کے لئے کیا گیا تھا تاہم یزید کی حماقت نے اسے عملی حقیقت میں بدل دیا اور حکومت خاندانِ بنو معاویہ سے نکل کر خاندانِ مروان میں منتقل ہو گئی۔

ہر چند اموی ارسٹا کریسی کے ارکان یا ان میں سے بھی کئی انفرادی اقتدار جوئی کی بناء پر ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے مگر اقتدار کو اموی خاندان میں محدود رکھنے اور خاندانِ اہلبیتؑ سے عداوت کے بارے میں زیادہ تر یکساں رجحان کے مالک تھے یقیناً چند مثالیں ایسی ضرور موجود ہیں جو اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسے ولید گورنر مدینہ جو یزید کا چچازاد بھائی تھا یا یزید کا بیٹا معاویہ بن یزید بن معاویہ جس نے باپ کے تخت پر اس لئے لات ماردی کہ اس تخت کے لئے حسینؑ ابن علیؑ کو شہید کیا گیا تھا، تاہم اموی طبقہ اشراف اہلِ بیتؑ کے بارے میں یکساں اندازِ نظر رکھتا تھا۔

تاریخ ہمیشہ اس تجربے سے گزری ہے اور جدید عہد بھی اس عام کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے کہ معاشرے کے ذہین تر افراد جو عام طور پر اخلاقی اقدار کے امین ہوتے ہیں ارسٹا کریسی کے حسد اور عداوت کا نشانہ بنتے ہیں۔ خاندانِ اہلِ بیتؑ اور ان کے ساتھی عرب معاشرے کے ذہین ترین افراد پر مشتمل تھے اور اس لئے قدرتاً ان بنیادی، تہذیبی

قدروں کے امین جن پر اسلام کے سماجی ڈھانچے کی بنیاد رکھی تھی لہٰذا اس خاندان کی عداوت کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ اموی ارسٹا کریسی کا مزاج اسلام دشمنی سے عبارت تھا۔ یزید اس نقطۂ نظر کے لئے ایک علامتی شخصیت بن گیا تھا۔ چنانچہ اس کا صاف اظہار اس نے کئی اشعار میں کیا ہے۔ جنہیں تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ کرلیا ہے۔ جب آلِ محمدؐ کے اسیروں کا قافلہ معہ سرہائے شہداء دمشق کے مضافات میں داخل ہوئے۔ یہاں جیرون نامی محل واقع تھا۔ یزید نے محل کے بالا خانے سے نیچے دیکھ کر اشعار پڑھے کر۔

لمابدت تلک الحمول و اشرفت　　تلک الردس علی ابی جیرون

لعب الغراب، قل اولا تقلی　　فلقد قضیت من الرسول دیون

"جب وہ سواریاں نظر آئیں سرہائے (شہداء) جیرون کی طرف بڑھے تو کوا کائیں کائیں کرنے لگا لیکن میں نے کہا تو کائیں کائیں کرے یا نہ کرے، میں نے تو پیغمبرؐ سے اپنے قرضے چکا لئے۔" کوے کی کائیں کائیں، علامتِ نحوست ہے۔ یزید نے کہا کہ اہلِ بیتؑ کے ساتھ سلوک میرے لئے منحوس ہو یا نہ ہو، میں نے تو اپنا بدلہ لے لیا۔ بدلے کا ذکر یزید کے دوسرے اشعار میں بھی موجود ہے۔

اہلِ بیتؑ کا یہ لٹا ہوا قافلہ اپنے شہداء کے ساتھ جب خاص دربارِ شاہی میں جو دمشق کے اندر واقع تھا پیش کیا گیا اور یزیدی فوج کے جرنیل زجر بن قیس جو قافلے کا نگراں تھا، شاہی افواج کے کارنامے بیان کر چکا تو یزید نے یہ شعر پڑھے۔

لیت اشیاخی ببدر شہدوا　　جزع الخزرج من وقع الاسل

لاھلّو و استھلّو فرحاً　　لقالو یا یزید لا تشل

لعبت ہاشم با الملک خلد　　ملک جاء ولا وحی نزل

’’کاش میرے جنگ بدر والے بزرگ (آج) زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ محمدؐ کے جاں نثار نیزوں کے برسنے سے جزع فزع کر رہے ہیں۔ وہ بیحد خوش ہو کر مجھے دعائیں دیتے۔ بنی ہاشم نے ملک کے لئے کھیل کھیلا تھا ورنہ نہ کوئی فرشتہ آیا نہ کوئی وحی نازل ہوئی۔‘‘

یہ اشعار صرف یزید کے خیالات کی نہیں پوری اموی ارسٹا کریسی کے رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم ان رجحانات اور ان کے نتائج پر کچھ اور سوچیں، ذرا ان اشعار اور اس صورتِ حال پر تھوڑا سا غور کرتے چلیں جو قافلۂ اہلِ بیت کی دمشق آمد کے سلسلے میں رونما ہوئی، میں جستہ جستہ اس بندوبست کا ذکر کیا گیا ہے جو اہلِ بیتؑ کے لٹے ہوئے قافلے کی تشہیر کے سلسلے میں دمشق میں کیا گیا تھا۔ لیکن اس تفصیل سے قطع نظر چند باتیں یہاں توجہ طلب ہیں۔

چند باتیں

اسرائے اہلِ بیتؑ کو اسی راستے سے دمشق لایا گیا تھا جو شاہی محل جیرون سے گذرتا تھا۔ جہاں یزید معہ اپنے ارکان و امراء کے موجود تھا۔ پھر اس قافلے کو جب دربارِ عام کے لئے خاص محل تک لایا گیا تو محل کے باہر کافی دیر تک روکا گیا۔ یہ بندوبست واضح طور پر سابقہ منصوبے کے تحت کیا گیا ہوگا۔ یزید قیدیوں کے دمشق میں داخل ہوتے وقت مضافاتی محل جیرون میں موجود تھا۔ وہاں سے وہ دربارِ عام میں پہنچا۔ اس کے وہاں پہنچنے اور دوسرے انتظامات کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی۔ اس لئے قافلۂ اہلِ بیتؑ کو کافی دیر تک محل کے باہر روکا گیا۔ یہ اشعار یزید نے فی البدیہہ تو کہے نہیں، پہلے سے وہ یہ اشعار بھی کہہ چکا تھا، اور وہ بھی جو دربار میں پڑھے گئے جس سے اس کی ذہنی کیفیت اور اس جذباتی تسکین کا اندازہ ہوتا ہے جو اس صورتِ حال سے اسے حاصل ہوئی۔ شعر میں کوّے کی کائیں کائیں

کرنے کا ذکر واقعی کسی کوّے یا کوّوں کی موجودگی کا ذکر نہیں ہے یہ تو محض استعاراتی اندازِ بیان ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ اقدام سیاسی طور پر کسی قدر بھی نحوست آئند کیوں نہ ہو، تاہم پیغمبرِ اسلامؐ سے بھرپور انتقام تو لے ہی لیا گیا۔ اب چاہے اس انتقام لینے کا کوئی بھی نتیجہ کیوں نہ نکلے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان اشعار کے ذریعے یزید اپنے باپ کے اس مشورے کی طرف اشارہ کر رہا تھا جو امام حسینؑ کے حقوق کی برتری، رسولؐ سے قرابت اور نرمی و شرافت کے سلوک کے سلسلے میں دیا گیا تھا اور جس میں امامؑ کے احترام کے خلاف اقدامات کے خطرناک نتائج اور امکانات سے ڈرایا گیا تھا۔

واقعات کے پس منظری مطالعے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اموی ارسٹاکریسی تین حصوں پر مشتمل تھی۔ ایک گروہ اسلام کی اساسی اخلاقی اقدار سے محبت کرتا تھا اور اس لئے اس کے دل میں خاندانِ پیغمبرؐ کا بڑا احترام تھا۔ اس گروہ میں یزید کا بیٹا جس نے تخت پر لات مار دی اور دوسرا ولید گورنر مدینہ تھا۔ جس نے امام حسینؑ کے صحیح و سالم مدینے کے دروازہ امارۃ چلے جاتے وقت مروان کی مخالفت کے جواب میں کہا تھا۔ ''خدا کی قسم مجھے یہ پسند نہیں کہ میں حسینؑ کو قتل کروں چاہے تمام مشرق و مغرب کی دولت بھی مجھے دے دی جائے۔''

دوسرا گروہ وہ تھا جو بنو ہاشم کی عداوت میں جل رہا تھا اور اسکی تمام کوششوں کا مقصود یہ تھا کہ اس خاندان کو نیست و نابود کر دیا جائے، تاہم یہ گروہ حتیٰ الامکان سیاسی جنگ لڑنا چاہتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر ہی خونریز جنگ وجدل کی طرف آتا تھا۔ اس گروہ کے خاص نمائندے یزید کے باپ تھے۔

تیسرا گروہ یزید، مروان اور ابنِ زیاد جیسے افراد پر مشتمل تھا اور انہیں کی اکثریت بھی تھی یہ طبقہ پیغمبرؐ اور ان کے خاندان سے اتنی شدید عداوت رکھتا تھا کہ اس کی شدت پر قابو

پانے کی اہلیت سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ واقعہ کربلا 61ھ سے بہت پہلے ہو چکا ہوتا اگر یزید کے باپ متشددانہ طرزِ عمل پر چلا کرتے۔ وہ جانتے تھے کہ امام حسینؑ بیعت کے لئے تیار نہیں ہیں، تاہم وہ اس مسئلہ کو آخری نقطے تک لے جانے کے لئے تیار نہ تھے۔ لہٰذا کربلا جو سیاست کے اختتام تک آخری نقطے کی حیثیت رکھتی تھی پیش نہ آسکی۔ یزید بھی ان نتائج سے باخبر تھا۔ وہ بھی یہ جانتا تھا کہ اگر مطالبے کو آخری حد تک نہ لیجایا گیا تو امام حسینؑ سے تصادم ناگزیز نہ ہوگا۔ یہی مشورہ اس کے باپ نے بھی دیا تھا مگر وہ معاملات کو آخری نقطے تک لے جانا چاہتا تھا چنانچہ اس کا صاف حکم تھا کہ حسینؑ بیعت سے انکار کریں تو سر قلم کر دیا جائے۔ ولید اس حد تک جانے کو راضی نہ ہوسکا لہٰذا اسے گورنری سے محروم ہونا پڑا۔ کوفے کی گورنری کے لئے ابنِ زیاد کا تقرر بھی اس کی اہلِ بیت اور بنو ہاشم کی عداوت کی خصوصیت کی بناء پر ہی عمل میں آیا تھا۔ کوفے کا سابق گورنر ان خصوصیات کا حامل نہ تھا لہٰذا زیاد کے بیٹے کو تمام ہدایات اور اختیارات کے ساتھ کوفے کی حکومت سونپی گئی۔

واقعات کو صحیح تناظر میں رکھنے کے لئے ان خطوط اور درخواستوں کا ذکر بھی یہاں کر لیجئے جو اہلِ کوفہ نے امام حسینؑ کی خدمت میں بھیجے تھے اور جن میں امام سے رہنمائی کی درخواست کی گئی تھی۔ بالفاظِ دیگر جن میں یزید کو حکومت کا طوق اتار پھینکنے کے لئے کہا گیا تھا۔ سوچا یہ جاسکتا ہے کہ اہلِ کوفہ کے ان اقدامات سے جو حکومتِ وقت سے بغاوت کے مظہر تھے دمشق کے لئے سخت اقدامات کا جواز مہیا ہو گیا تھا اور یوں وہ عذر جو ہر ظالم حکومت پیش کرنے کی عادی رہی ہے یعنی امن و قانون کا تحفظ دمشق کے حکمرانوں کے ہاتھ آگیا تھا لیکن یہ خیال واقعات کے منطقی اور واقعاتی تسلسل کے ساتھ میل نہیں کھاتا تھا۔

دمشق میں جب معاویہ ابن ابوسفیان کی موت واقع ہوئی تو اس وقت یزید شکار

کھیلنے گیا ہوا تھا۔ تخت نشینی کے فوراً بعد یزید نے گورنر مدینہ کو دو مراسلے بھیجے جن میں سے ایک میں اپنے باپ کی موت اور دوسرے میں امام حسینؑ سے بیعت اور عبداللہ ابن زبیر سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بعض کا بیان ہے کہ ہدایت نامے میں عبداللہ ابن عمرؓ کا نام بھی درج تھا۔ تاریخ میں جو معلومات بکھری ہوئی ہیں ان کو جوڑ کر جو تصویر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ 26 رجب 60 ھ میں جمعہ کے دن صبح کے کسی وقت یزید کا ہدایت نامہ ولید کو مدینے میں ملا۔ ولید مروان سے بہت ناراض تھا تا آنکہ بات تک کرنے کا روادار نہ تھا لیکن یزید کے اس حکم نامے کے سیاسی مضمرات کے پیش نظر مناسب اس نے یہ سمجھا کہ مروان سے بھی مشورہ کرلے اور معاملات کی نزاکت دیکھتے ہوئے خود مروان نے اپنی ناراضگی کو بالائے طاق رکھ دیا اور ولید کے ساتھ مشوروں میں شریک ہونے دارلامارۃ پہنچ گیا۔ مروان ولید کے پاس موجود تھا کہ امام حسینؑ تشریف لائے۔

نمازمغربین کے بعد امام حسینؑ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ولید کا ہرکارہ آیا اور طلبی کا پیغام پہنچایا۔ امام حسینؑ مسجد سے سیدھے دارالامارۃ گئے بلکہ پہلے گھر گئے اور وہاں سے کئی اعزا اور متعلقین کے ساتھ گورنر ہاؤس آئے۔ اندازہ اس سے یہ ہوتا ہے کہ رات کافی گزر چکی ہوگی کہ گورنر ہاؤس میں یہ ملاقات ہوئی۔ یوں سمجھئے کہ نصف رات کے قریب امام حسینؑ دارالامارۃ پہنچے۔ ملاقات چند منٹ میں ختم ہوگئی اور امام واپس اپنے گھر پہنچ گئے۔ ہفتہ اور اتوار کا دن سفر کی تیاری میں گزرا اور اتوار اور پیر کی درمیانی شب میں صبح ہونے سے پہلے مکہ کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ سفر میں اولاد ابوطالب آپ کے ساتھ تھے۔ آپ سے پہلے عبداللہ ابن زبیر غیر معروف راستوں سے مکہ روانہ ہو چکے تھے لیکن امام حسینؑ نے معروف و متعارف راستے کو اپنے سفر کے لئے چنا، پانچ دن کے سفر کے بعد جمعہ کی شب کو وارد مکہ

ہوئے اور شعب علی نامی محلے میں قیام کیا۔ ابن زبیر دو دن پہلے مکہ پہنچ چکے تھے۔

معاویہ ابن ابوسفیان کی موت یزید کی جانشینی اور امام حسینؑ کی مکے آمد کی خبر شدہ شدہ تمام عالم اسلام میں پھیل گئی۔ کوفے میں جو اموی سامراجیت کے مخالفین کا گڑھ تھا۔ ان خبروں نے ایک نئی سرگرمی پیدا کر دی اور انقلابیوں کا گروہ سلیمان ابن صرد خزاعی کے گھر میں جمع ہوا اور پُر جوش تقریروں کے بعد طے ہوا کہ امام حسینؑ کو کوفے آنے کی دعوت دی جائے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ یہ اجتماع شعبان 60ھ کے تیسرے ہفتے میں ہوا ہو گا۔ جلسے کے فیصلے کے مطابق ایک خط امام حسینؑ کی خدمت میں روانہ کیا گیا جو دس (۱۰) رمضان کو امامؑ کو مکے میں ملا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ آپ کے تشریف لانے کی خبر ہمیں مل جائے تو ہم انقلاب برپا کرنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر اس کے بعد دو ہی دن میں کوفے کے دوسرے انقلابیوں کی طرف سے باون (۵۲) عرضداشتیں تیار ہو گئیں جو مختلف افراد کے ذریعے مکے روانہ کر دی گئیں۔

واقعات کے اس تسلسل کو سامنے رکھا جائے تو کئی چیزیں سامنے آتی ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ یزید کے اس حکم کے بعد جو گورنر مدینہ کو طلبی بیعت کے سلسلے میں لکھا گیا اور اس انقلابی جلسے کے درمیان جو یزید کی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے سلسلے میں سلیمان ابن صرد خزاعی کے مکان پر ہوا اور جس میں انقلاب برپا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایک ماہ سے زیادہ کا فاصلہ تھا۔ یزید نے گورنر مدینہ کو جو حکم نامہ بھیجا اس سے رجب 60ھ کے دوسرے ہفتے کی تاریخ میں دستخط کئے ہوں گے اور یہ انقلابی جلسہ شعبان 60ھ کے غالباً تیسرے ہفتے میں ہوا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اگر امام حسینؑ کی بابت خبر نہ پہنچتی کہ وہ یزید کی بیعت سے منکر ہیں تو یہ انقلابی جلسہ نہ ہوا ہوتا۔

امام کے انکارِ بیعت نے یہ موقع مہیا کیا کہ انقلابی لیڈر میدان میں اتر آئے واضح طور پر اگر یزید مطالبۂ بیعت نہ کرتا تو انکار کی نوبت ہی نہ آتی اور یوں یہ انقلاب جسے دمشق نے بغاوت قرار دیا ہوگا، شروع نہ ہوتا۔ مطلب اس کا یہ کہ یہ یزید کی سب سے مہنگی سیاسی غلطی یا خطرناک سیاسی منصوبہ تھا۔ جس کے بارے میں اس کے باپ پہلے متنبہ کر چکے تھے۔ تیسری سب سے اہم اور قابل توجہ بات یہ کہ امام حسینؑ نے پورے پانچ ہفتے مکے میں گزارے یعنی 3 شعبان 60ھ سے 10 رمضان 60ھ تک۔ لیکن کوئی خط عوامی تحریک شروع کرنے کے سلسلے میں کسی کو نہ لکھا۔ یوں تو نہیں ہوا کہ امام حسینؑ نے اپنے انکارِ بیعت اور مکے آمد کی اطلاع اہلِ کوفہ کو دی ہو؟ اور پھر دمشق کی مخالفت کرنے والے حکومت سے ٹکرانے کے لئے جمع ہو گئے ہوں۔

نازک توازن

یزید نے اپنے جذبۂ انتقام میں اس نازک توازن کو بگاڑ دیا جو ربیع الاول 41ھ یا جمادی الاول 41ھ میں امام حسنؑ اور معاویہ ابن ابوسفیان کے معاہدے کے نتیجے میں قائم ہوا تھا اور جس کو باقی رکھنے میں امام حسنؑ پھر امام حسینؑ نے پوری کوشش کی تھی۔ یہ نازک توازن براہِ راست تصادم اور خون خرابہ روکنے سے عبارت تھا ہر چند یزید کے باپ نے اس نازک توازن کو بار بار بگاڑنے اور معاہدے کو توڑنے کے سلسلے میں پے در پے اقدامات کئے تاہم اس آخری حد کو عبور کرنے کی کبھی جسارت نہ کی، جہاں امام حسینؑ کیلئے اس نازک توازن کو باقی رکھنا ممکن نہ ہوتا اور جس کے بعد اصولی و اخلاقی طور پر خاموشی موجب ذلت بن جاتی، صرف مطالبۂ بیعت وہ آخری قدم نہ تھا جو یزید اس نازک توازن کو درہم برہم کرنے اور ممکن حماقتیں کرنے کی انتہائی حد کو عبور کرنے کے سلسلے میں اٹھا سکتا تھا۔

رجب 60ھ کے دوسرے ہفتے میں یزید نے اس حد کو عبور کر لیا اور امام حسینؑ کو 26 رجب 60ھ کو سرکاری طور پر گورنر ہاؤس مدینے میں یہ اطلاع پہنچا دی گئی کہ یزید اس نازک توازن کو باقی رکھنے کیلئے تیار نہیں ہے جو حسنؑ معاویہ معاہدے میں قائم کیا گیا تھا۔ دمشق نے صرف مطالبۂ بیعت ہی نہیں کیا بلکہ اس مطالبے کی متقابل صورت یعنی تہدید و تحریص کی اس پالیسی کو بھی بدل کر رکھ دیا جواب تک دمشق کے اقدامات کی آخری حد تھی۔ نئی پالیسی یہ قرار پائی کہ حسینؑ بیعت کریں ورنہ (یا) موت کے لئے تیار ہو جائیں۔ بیعت کے سلسلے میں امام حسینؑ اس متبادل صورت کے لئے شروع سے تیار تھے۔ دمشق اب تک فیصلہ کن تصادم سے بچتا رہا تھا ورنہ واقعۂ کربلا امام حسنؑ کی شہادت کے بعد خاص طور پر 53ھ کے بعد جب سے بیعت کا مطالبہ شروع ہوا تھا، کسی وقت بھی رونما ہو سکتا تھا۔

اس تمام گفتگو میں جو پہلو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ امام حسینؑ کی بیعت کے بغیر بھی یزید کی حکومت چل سکتی تھی بلکہ باپ کہنا یہی چاہتے تھے کہ یزید امام حسینؑ کو چھیڑے بغیر حکومت کرتا رہے۔ بظاہر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ خود یزید بھی یہ سمجھتا تھا کہ اس کی حکومت کی راہ میں امام حسینؑ حائل نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اگر یزید کا خیال یہ ہوتا کہ امام حسینؑ کی زندگی میں اس کی حکومت نہیں چل سکتی تو وہ باپ پر دباؤ ضرور ڈالتا کہ انہیں بھی راستے سے ہٹا دیا جائے۔

باپ امام حسینؑ کو شہید کرنے کے سیاسی مضمرات سے آگاہ تھے اور اس لئے اس حد کو عبور کرنے سے منکر تھے، مگر بیٹا جو منفی اقدار پرستی کا نمائندہ اور مہذب اخلاقی اقدار کا دشمن تھا۔ ایک ایسے شخص کو برداشت نہ کر سکتا تھا جو مثبت تہذیبی قدروں کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس لئے بیعت کا مطالبہ ایک عذر کے طور پر پیش کیا گیا تھا کہ اس مطالبے کے اقرار اور انکار دونوں صورتوں میں اموی ارسٹاکریسی کے منفی مشتعل جذبات کی تسکین ہو سکتی تھی۔

بیعت کے مطالبے کے منظوری کی صورت میں بھی پیغمبرؐ اور ان کے خاندان کی اور ان اخلاقی اقدار کی جڑ کٹ جاتی جن کی آنحضرتؐ اور ان کا گھرانہ نمائندگی کرتا تھا۔ ایک ناقابل تصور توہین ہوتی۔ رسولؐ اور ان کے خاندان کی اور یوں وہ انتقام پورا ہو جاتا جس کی آگ اموی ارسٹا کریسی کے سینوں میں سلگ رہی تھی جبکہ انکار کی صورت میں وہ افراد موجود نہ رہتے جن سے یزید اور اس کے ہم نوا عداوتیں لئے بیٹھے تھے، تاہم دمشق نے اس بات کا اہتمام کیا کہ بات صرف جسمانی شقاوتوں تک محدود نہ رہے بلکہ اہانت کے وہ ہتھیار بھی استعمال میں آجائیں جو دمشق کے اسلحہ خانے میں موجود تھے۔

سوچ کی یہ سمت صحیح ہو تو پھر کہا جاسکتا ہے کہ یزید ہر حال میں امام حسینؑ کو شہید کرنے پر بضد تھا بلکہ اتنا ہی نہیں وہ اس نوع کا منصوبہ بھی اپنے ذہن میں رکھتا تھا۔ اس خیال کی تائید میں تاریخ نے ایک واقعہ بھی ہم تک پہنچایا ہے۔

کوفے کے نسبتاً معقولیت پسند گورنر نعمان ابن بشیر کو ہٹا کر بصرے کے گورنر عبید اللہ ابن زیاد کو بصرے کے ساتھ کوفے کا گورنر مقرر کرنے کے سلسلے میں یزید نے جو حکم نامہ ابن زیاد کو لکھا اس میں ہم یہ الفاظ بھی پڑھتے ہیں۔

''اس وقت ایک بڑا منصب تمہارے سپرد کیا جارہا ہے جس سے بڑھ کر تمہارے لئے کوئی اعزاز نہیں ہوسکتا اور اتفاق سے حسینؑ کی مہم تمہارے ہی قلمرو مملکت کے نصیب میں آئی ہے۔ اب تمام عمال حکومت میں تم ہی وہ ہو اس عمل آزمائش میں پڑے ہوئے۔ اب یا تو تمہاری شرافت پایہ ثبوت تک پہنچ جائے گی اور یا جیسے کبھی تھے ویسے ہی غلام کے غلام قرار پاؤ گے۔

آخری جملوں میں یزید نے کہا اگر تم اس مہم میں کامیاب ہوئے تو اموی خاندان

کے رکن ثابت ہو گے — ورنہ تمہارے باپ زیاد کو خاندان امیہ میں شامل کرنے کا جوڑ رامہ رچایا گیا تھا وہ بے نتیجہ رہے گا اور یوں غلام کے غلام ہی رہو گے۔

عجیب بات ہے کہ آزاد لوگ اموی ارسٹاکریسی کے ارکان تھے اور مسلم معاشرے کے تمام دوسرے لوگ غلاموں میں شامل تھے۔ حسینؑ کی مہم کے ابن زیاد کے نصیب میں آنے کا ذکر اور تمام عمال حکومت میں اس کا اس مہم کو سر کرنے کے لئے انتخاب واضح طور پر اس منصوبے کی نشان دہی کرتا ہے جو امام حسینؑ کے بارے میں یزید کے ذہن میں موجود تھا۔

یہاں مناسب نہ ہوگا کہ اس بات کا ذکر بھی کر دیا جائے کہ یزید سیاسی زندگی کے تقاضوں اور مضمرات سے ناواقف نہیں تھا۔ خود اس خط سے اور پھر اس کے ایک دوسرے خط سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔

وہ دوسرا خط یہ ہے:

''مجھے میرے شیعوں نے کوفے سے خطوط لکھے ہیں کہ وہاں پسرِ عقیل نے لشکر جمع کرنا شروع کر دیا ہے تا کہ مسلمانوں میں تفرقہ اور فساد پیدا ہو۔ تم اس خط کے پہنچنے کے ساتھ ہی ادھر روانہ ہو اور مسلم کو قبضے میں لا کر قید کرو، قتل کرو یا نکال دو۔''

مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہونے پر یزید کی پریشانی ایسی ہی ہے جیسی انگریزی محاورے کے مطابق ''شیطان کتبِ سماوی کے حوالے دینے لگے۔'' واضح طور پر پریشانی کا یہ اظہار محض سیاسی نعرے بازی کے طور پر ہے تاہم اس سے ظاہر ہوا یزید بھی سیاسی فریب دہی کا فن جانتا تھا۔ مطلب اس کا یہ کہ اگر یزید سیاسی انداز پر جنگ لڑنا چاہتا، تو لڑ سکتا تھا مگر اس نے پہلے ہی مرحلے پر دو ٹوک قدم اٹھا لیا اور بیعت کے پلڑے کے مقابل پلڑے میں

قتل کو رکھ دیا تا کہ امام حسینؑ کے لئے کوئی راہِ انتخاب باقی نہ رہے۔

مسلمانوں میں تفرقہ پڑ جانے کا خوف، کیا عجیب بات پیدا کی ہے، دمشق کے حکمرانوں نے اس جملے کو خاص طور پر نوٹ کر لیجئے کہ تاریخِ اسلام نے آئندہ بھی بار بار جابر بادشاہوں کو اپنے مظالم چھپانے کے لیے یہی عذر دیا جاتا رہا ہے اور ایک تاریخِ اسلام ہی کیا، دنیا بھر کے جابروں کی تاریخ ضمیر کے مبلغوں کو عوام میں تخریب پیدا کرنے کا مجرم قرار دیتی رہی ہے لیکن یہاں یہ المناک ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ نواسۂ رسول امام حسینؑ جن کے گھر سے دنیا نے اسلام کا پیغام سنا ان ہی کو دمشق کے وہ حکمران جنہیں اسلام سے چڑ تھی، مسلمانوں میں تفرقہ انگیزی کا مجرم گردان رہے ہیں لیکن مضحکہ خیز شوخ چشمی سے قطعہ نظر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یزید ایسا الھڑ اور نادان نوجوان نہ تھا جیسا بعض لوگ باور کرنا چاہتے ہیں وہ سیاسی نعرہ بازیاں پوری طرح جانتا تھا اور حکمرانوں کی چالاکیوں کے داؤ پیچ سے کماحقہ آگاہ تھا۔ سعید ابنِ عثمان صاحب کے واقعے میں بھی وہ سیاسی مہرہ بازیاں کرتے نظر آتا ہے اور یہاں بھی چالاک حکمرانوں کی طرح چلتے ہوئے نعرے تراشتا دکھائی دیتا ہے۔

کیا یہ بیوقوف اور نادان حکمرانوں کے لچھن ہیں یا چالاک بادشاہوں کی ابلہ فریبیاں؟

ڈی فیکٹو اور ڈی جوری

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے حسینؑ کبھی نہیں ڈرے انہوں نے بیعت کے مطالبے کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے ٹھکرایا اور وقت آیا تو شہادت کو خوشی خوشی قبول کر لیا۔ اس لئے یہ سوچ صحت پر مبنی نہ ہوگی کہ حسینؑ نے حکومت کے خلاف عوامی بغاوت منظّم نہ کر کے کوتاہی کا مظاہرہ کیا، عوامی بغاوت صرف نعرہ بازی اور جذبات پرستانہ سرگرمیوں کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک سیاسی سائنس کا ٹھوس معروضی عمل ہے جو خارجی سوشیالوجیائی مطالعے

پر مبنی ہو تو نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے ورنہ ایک وقتی باغیانہ ابھار کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔

حسینؑ تاریخی منطق کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ وہ اس سماجی ٹیڑھ کو پوری وضاحت کے ساتھ جانتے تھے۔ جس کی موجودگی میں عوامی انقلاب کی کوئی تحریک کامیابی حاصل نہ کر سکتی تھی۔ یہی سماجی ٹیڑھ تھی جس نے امام حسنؑ کو دمشق سے مصلح تصادم کی صورت حال ختم کرنے پر آمادہ کیا تھا لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ وہاں کوئی مسئلہ بیعت کا نہ تھا یعنی یہ نہیں ہوا کہ امام حسن علیہ السلام نے دمشق کے حکمران کی بیعت کر لی ہو، بلکہ معاہدے میں ایک روایت کے مطابق یہ لکھا گیا کہ امیرِ شام کی موت کے بعد امام حسنؑ جانشین ہوں گے اور دوسری روایت کے مطابق یہ طے ہوا کہ معاویہؓ اپنا کوئی جانشین مقرر نہ کریں گے۔ مطلب اس کا یہ کہ امام حسنؑ نے صرف اس عملی حقیقت کو تسلیم کیا کہ دمشق ممالک محروسہ پر فوجی کنٹرول رکھتا ہے۔ یہ نہیں کہ دمشق کے حکمران حق حکومت بھی رکھتے ہیں۔ بیعت کر لینے کا مطلب حق حکومت کو بھی تسلیم کر لینا ہے۔ صرف حکومت کی عملی حقیقت ہی ہو تسلیم کرنا نہیں ہے۔ امام حسینؑ نے بھی اپنے بھائی کے معاہدے کے بعد دمشق کے عملی اقتدار کی حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اسی لئے بار بار معاہدے کی پابندی کا حوالہ دیتے تھے۔ امام حسنؑ کی طرح امام حسینؑ بھی دمشق کی ڈی فیکٹو حکومت تسلیم کرتے تھے، ڈی جوری نہیں۔ یزید کے باپ اس صورتِ حال پر قانع تھے کہ امام حسنؑ اور ان کے بعد امام حسینؑ دمشق کی ڈی فیکٹو حکومت تسلیم کرتے رہیں، چاہے ڈی جوری طور پر تسلیم نہ کریں۔ بالالفاظ دیگر معاویہ کہتے تھے کہ حسینؑ دمشق کے حق حکومت کو تسلیم نہ بھی کریں تو بھی انہیں برداشت کیا جائے، ہاں یہ کوشش برابر جاری رکھی جائے کہ دمشق کے حقِ حکومت کو تسلیم کر لیں اِدھر امام حسینؑ کا موقف یزید کے عہد میں بھی اور اس کے باپ کے عہد میں بھی یہ رہا کہ وہ دمشق کی حکومت کے حقیقت ہونے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ امر کہ یہ عملی حکومت جائز حقِ حکومت پر بھی مبنی

ہے سوا سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں جبکہ بیعت کر لینے کی صورت میں اس عملی حقیقت کا جائز حق پر مبنی ہونا تسلیم کر لیا جاتا۔ ڈی جوری، (حق حکومت کا جواز) طرز پر دمشق کی حکومت کو تسلیم کرنا نہ کرنا حسینؑ کے قبضے میں تھا لیکن ڈی فیکٹو طرز پر صرف تسلیم کرنا تو قبضے میں تھا تسلیم نہ کرنا قبضے میں نہ تھا، یہاں یہ نہ کہیے کہ یہ بھی امام حسینؑ کے قبضے میں تھا۔ وہ عوامی انقلاب برپا کر کے ڈی فیکٹو طرز پر بھی دمشق کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ اس صورت میں امام حسینؑ کو انقلاب برپا کرنے کا نہیں صرف انقلاب کا اعلان کرنے کا حق حاصل ہوتا۔ ایک ایسے انقلاب کے اعلان کرنے کا حق جو طے شدہ طور پر ناکام ہو جاتا۔ ناکام ہونے کا مطلب امام حسینؑ تو شہید ہو جاتے مگر یزید کو بغاوت دبانے کا سیاسی حق بھی مل جاتا۔

گویا امام حسینؑ کے سامنے صورتِ حال یہ تھی کہ انہیں دونوں صورتوں میں شہادت تک پہنچنا ہے۔ اب سوال یہ تھا بہتر صورت کون سی تھی جو قانونی و اخلاقی طور پر نسبتاً زیادہ صاف ستھری ہو حسینؑ ڈی فیکٹو طور پر بھی حکومت کو نہ مانتے اور عوامی انقلاب کا نعرہ دے دیتے تو واضح طور پر ڈی جوری طور پر حکومت کو نہ ماننے کی منطق تسلیم کر کے ہی ڈی فیکٹو طور پر حکومت کے تسلیم نہ کرنے کا جواب پیدا ہوتا لیکن ڈی فیکٹو طور پر دشمن کے اقتدار کو چیلنج کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ حکومت کو امن و قانون (لاء اینڈ آرڈر) کی حفاظت کا عذر ہاتھ آ جاتا لیکن ڈی جوری طور پر حکومت کو تسلیم نہ کرنے کی صورت میں یہ عذر حکمرانوں کو حاصل نہ ہوتا۔

یزید کی حکومت ظالم اور جابر حکومت تھی اور ایک ظالم اور جابر حکومت کے خلاف بغاوت ایک شریفانہ اقدام تھا لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر شریفانہ اقدام ہمیشہ ہوشمندانہ اقدام بھی ہو۔ یزیدی سرکار کے خلاف بغاوت بھی شریفانہ اقدام ہوتی لیکن ہوشمندانہ نہیں

اس لئے کہ اس کی کامیابی کا امکان صفر کے برابر ہوتا۔ شکست لازمی اور موت یقینی تھی۔ حسینؑ نے موت کو تو قبول کر لیا مگر شکست سے بچ گئے خود خروج کرتے تو شکست کا سوال منطقی طور پر پیدا ہوتا۔ رہی موت تو دونوں صورتوں میں یقینی تھی لہٰذا حسینؑ نے موت کو چن لیا اور شکست کا الزام اٹھانے سے بچ گئے اور حکمرانوں کو امن اور قانون بحال کرنے کے عذر سے بھی محروم کر گئے۔ یہ بات کسی خیال آفرینی پر مبنی نہیں کہ امام حسینؑ واقعات کا آخری نتیجہ اپنی شہادت جانتے تھے۔ اس لئے دمشق نے یہ بات چھپا کر نہ رکھی تھی کہ وہ امام حسینؑ کو شہید کرنے پر مصر ہے۔ امام حسینؑ ہی نہیں خود یزید کے باپ بھی واقعات کے اس منطقی نتیجے کو کہ امام حسینؑ بیعت نہ کرنے کے نتیجے میں شہید ہوں گے، پوری طرح جانتے تھے چنانچہ جب وہ یزید کی جانشینی کو منوانے کے لئے مدینے کے قریب پہنچے تو امام حسینؑ سے ملاقات ہو گئی۔ امام کو دیکھ کر انہوں نے کہا "تمہارے لئے خوشی ہو نہ برکت۔ تم قربانی کا ایک دنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ خدا کی قسم یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔" امام حسینؑ نے جواب دیا — چپ رہو ہم اس جیسے کلام کے مستحق نہیں ہیں اس پر شامی حکمران نے کہا — تم اس سے بھی بدتر کلام کے مستحق ہو۔

امامؑ کے جواب سے یہ بات واضح ہے کہ انہیں دمشق کے سلطان کے صرف اندازِ تخاطب پر اعتراض تھا۔ نفسِ مضمون پر نہیں۔ حسینؑ نے یہ نہیں کہا کہ "کس کی مجال ہے جو ان کی جان لے سکے۔" کہا تو یہ کہ وہ طرزِ مخاطبت جو معاویہ نے اختیار کیا ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ادھر خود امام حسینؑ بھی بار بار اپنی شہادت کی پیشگوئی کرتے رہے تھے۔ اس لئے یہ بات صاف ہے کہ امام شہادت کو حالات کے ناگزیر منطقی نتیجے کے طور پر دوسری طرح جانتے تھے۔ اس لئے سوال اس منطقی نتیجے کو بدلنے کا نہیں تھا بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے

زیادہ بہتر زیادہ مناسب راہ اختیار کرنے کا تھا۔

حکومت کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں ڈی فیکٹو اور ڈی جوری کے امتیاز کو سامنے رکھنا تاریخ کے کسی اور انقلابی لیڈر سے ممکن نہیں ہوسکا۔ انقلابی لیڈر جارحانہ انداز میں حکومتوں سے متصادم ہوتے رہے۔ حکومت جابر و ظالم ہو اور عام طور سے حکومتیں جابر ظاہری ہوتی ہیں تو انقلابیوں کی یہ جارحیت اخلاقی سیاسیات کی رو سے خواہ پورا جواز رکھتی ہوں تاہم اس میں ایک نقص یہ رہ جاتا ہے کہ تشدد کے مقابل جب انقلابیوں کی متشددانہ سرگرمیاں آتی ہیں تو بات ذرائع حصولِ مقصد کی حد تک برابر ہوجاتی ہے۔ چاہے خود مقصد کی حد تک انقلابیوں کو برتری ہی کیوں نہ حاصل ہو لیکن امام حسینؑ نے انقلاب کی تاریخ میں جو ٹیکنیک متعارف کرایا وہ یہ تھا کہ شہادت کی منزل تک غیر جارحیت کے راستے سے پہنچا جائے تاکہ حکومت کی جارحیت کے مقابلے میں انقلابی ہیرو کی غیر جارحیت آئے۔ یوں مقاصد کے حصول کا خود ذریعہ بھی حکومت کے اختیار کردہ ذرائع سے برتر ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ تاریخ میں مظلومیت کی علامت اور یزید ظلم کی علامت (Symbol) بن گیا۔ ورنہ اگر امام حسینؑ گورنر مدینہ ولید سے ملاقات کے فوراً بعد اعلانِ انقلاب کر دیتے تو ان کے اقدام میں بھی جارحیت آجاتی۔ اگرچہ ان کا مقصد ضرور اعلیٰ اور برتر ہوتا مگر ذریعہ حصول مقصد میں دمشق اور وہ یکساں سطح پر رہتے۔

26 رجب 60ھ سے لے کر 10 محرم کی صبح تک یعنی جب باقاعدہ مقابلہ ٹھن گیا۔ امام کا ہر قدم غیر جارحانہ تھا لیکن یہ غیر جارحیت بہادرانہ طور پر ظلم کا مقابلہ کرنے کے جذبے یا ہمت کے فقدان کی بناء پر نہ تھی چنانچہ 10 محرم کی جنگ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی غیر معمولی جرأت، بہادری، حیرت انگیز قوتِ مقابلہ، ثابت قدمی اور نڈر پن کے لازوال ثبوت کے طور پر تاریخ کے سینے پر مرتسم ہے۔

منصوبہ

یزید ایک منصوبے کے تحت امام حسینؑ کو شہید کرنا چاہتا تھا اور حسینؑ ایک منصوبے کے ساتھ شہادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ 26 رجب کے بعد سے 10 محرم تک انہوں نے جتنے اقدامات کئے وہ ایک طاقتور ذہن کے ایک شاندار منصوبے کا پتہ دیتے ہیں۔

مدینے سے مکے جانا جہاں مچھر تک کو مارنا ممنوع ہے، ایک اس حکومت کو انتہائی سنگین آزمائش میں ڈال دیتا تھا۔ جس کا حکمران مسلمانوں میں فتنہ انگیزی کو روکنا اپنا مقصد قرار دینے کی جرأت رکھتا ہو۔

دمشق کی بیوروکریسی کے سامنے مکے کے احترام کا کوئی سوال نہیں تھا۔ یہ سوال ہوتا تو واقعہ کربلا کے دو سال بعد ہی مکے پر یزیدی افواج حملہ نہ کرتیں اور منجنیقوں سے بھیانک گولہ باری کر کے کعبے کو مسمار نہ کر دیتیں لیکن اس جیسے اقدام کیلئے کوئی جواز تو ہونا چاہیے تھا۔ یہ جواز اہلِ مکہ کی بغاوت نے مہیا کر دیا تھا لیکن حسینؑ 3 شعبان کو مکہ پہنچنے کے بعد 10 رمضان تک یعنی اس وقت تک بالکل خاموش رہے جب تک اہلِ کوفہ کے خطوط ان تک نہ پہنچے۔ ان خطوط کے باوجود انہوں نے اگر کوئی قدم اٹھایا تو اس قدر کہ کوفیوں کے اصرار پر حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کر دیا اس موقع پر عمائدین کوفہ کے نام امام حسینؑ نے جو خط لکھا وہ کافی معنی خیز ہے:

ھانی اور سعید تمہارے خطوط لے کر پہنچے اور یہ دونوں تمہارے آخری قاصد ہیں جو میرے پاس آئے ہیں۔ جو کچھ تم نے لکھا ہے میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ تم میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں ہے۔ آپ آیئے شاید خدا آپ کی بدولت ہمیں حق پر جمع کر دے۔ اچھا تو میں تمہاری جانب اپنے بھائی چچا کے بیٹے اور معتمد خصوصی

(مسلم بن عقیل) کو روانہ کرتا ہوں اور انہیں حکم دیتا ہوں کہ وہ تمہارے حالات سے مجھے اطلاع دیں۔ اگر انہوں نے لکھا کہ تمہاری جماعت اور اہل حل وعقد اس امر پر متفق ہیں، جس کا تم نے اپنے خطوط میں ذکر کیا ہے تو میں عنقریب تمہاری طرف آتا ہوں اور واضح رہے کہ امام کے معنی اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ وہ (امام) کتاب الٰہی پر عامل، عدل کا پابند، حق کا منبع اور اپنی ذات کو خدا کی مرضی کے لئے وقف کئے ہوئے ہو۔''

اس خط سے جو حضرت مسلمؑ بن عقیل کے دورے کے مقاصد اور دائرۂ کار کے بارے میں سب سے حتمی دستاویز ہے۔ یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ جناب مسلمؑ بن عقیل کا مشن محض جائزہ مشن تھا۔ اس کا کام صرف اس قدر تھا کہ وہ کوفے کے حالات کا جائزہ لے کر امامؑ کو رپورٹ دیں۔ گویا یہ تاثر صحت پر مبنی نہیں ہے کہ مسلم بن عقیل کو فتح کوفہ کے لئے بھیجا گیا تھا۔ خط میں یزید کی جانشینی، بیعت سے انکار، شامی حکمران کے ناجائز تقرر اور حکومت کے خلاف انقلاب یا بغاوت کی فوری ضرورت پر زور دینے سے متعلق کوئی بعید ترا شارہ بھی موجود نہیں۔ مکتوب میں جو انتہائی مدبرانہ اور تحمل آمیز اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ جس صورت حال کو سامنے لایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اہل کوفہ جو حق کے متلاشی ہیں امامؑ کو جو روحانی پیشوا کا مقام رکھتے ہیں، رہنمائی کے لئے بلا رہے ہیں۔ رہنمائی کی اس درخواست کو رد کرنا ان فرائض سے ہم آہنگ نہیں جس پر ایک روحانی قائد فائز ہوتا ہے لہٰذا امامؑ اس پر لبیک کہتے ہیں مگر ان مطالبات، دعاوی اور مواعید کا جائزہ لینے کیلئے جو عمائد کوفہ کر رہے ہیں اپنے ابنِ عم کو جو معتمد خصوصی ہیں جائزہ مشن پر روانہ کرتے ہیں۔ بس اور فقط، اس قدر، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں یعنی بغاوت پر اکسانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یوں کہیے کہ اگر کوفے والوں کا اصرار نہ ہوتا اور قیام پُر خطر نہ بن جاتا تو امامؑ مکے ہی میں قیام فرماتے۔26

رجب 60ھ سے لے کر جب سرکاری طور پر امام حسینؑ کو بیعت یا شہادت کے درمیان انتخاب کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ 7 ذی الحج 60ھ تک جب امامؑ نے مکے سے سفر اختیار کیا، ساڑھے چار ماہ کا وقفہ گزرا۔ اس تمام مدت میں امام نے کوئی خط عالم اسلام کے کسی حصے کے باشندوں کو طلب امداد یا دمشق کے خلاف مسلح جدوجہد کی تلقین کے سلسلے میں روانہ نہیں کیا۔ خود مکے میں کسی فوج کو منظم کرنے یا رضا کاروں کو بھرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ 19 سال کی مدت حسنؑ، معاویہؒ معاہدے کے تحت عہد معاویہ میں گزاری جبکہ معاہدے کی فوری خلاف ورزی کر دی گئی تھی اور بار بار کی جاتی بھی رہی۔ سات سال کی مدت یزید کی جانشینی کے اعلان کے بعد معاویہ کی زندگی میں بسر کی اور ساڑھے چار ماہ خود یزید کے دور میں گزارے۔ مگر یہ ساری مدتیں کسی باغیانہ تیاری کے بغیر گزر گئیں۔ ایسے میں دمشق کو کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہ بیعت کے مقابلے میں موت کو بدل کے طور پر پیش کرتا۔

امام حسینؑ سفر کوفہ پر مصر نہ تھے۔ قیام مکہ پر مصر تھے۔ اسی لئے انہوں نے کوفیوں کے پیہم اصرار کے باوجود فوری طور پر صرف حضرت مسلمؑ بن عقیل کو کوفہ بھیجنے پر اکتفا کیا۔ کوفہ امام کے سفر کی مجبوری منزل تھا۔ شروع سے ارادہ کوفے جانے کا معلوم نہیں ہوتا۔ مکہ کے سفر کا قصد یہ بتاتا ہے کہ کوفہ امام حسینؑ کی منزل نہ تھا۔ صورت یہ ہے کہ کوفہ مدینے سے شمال مشرق میں واقع ہے جبکہ مکہ مدینے سے جنوب میں ہے۔ مکے سے کوفے جاتے ہوئے تو مدینے سے گزرا جا سکتا ہے مگر مدینے سے مکہ جانے والے کے لئے کوفہ منزل مقصود نہیں بن سکتا۔

مدینے سے مکہ جانے کا مطلب یہ ہوا کہ امام کوفے سے مزید دور ہو گئے اور مزید مطلب اس کا یہ ہوا کہ سفر مکہ کے وقت کوفہ جانے کا کوئی تصور ذہن میں نہ تھا۔ مگر مکہ —! کیوں؟ کس لئے مکے کو منزلِ مقصود بنایا گیا۔ واضح طور پر اس لئے کہ مکہ جائے امن تھا اور یزیدی حکومت

کی مکے کی بے حرمتی کرنے سے پہلے تک تو قصہ یہ تھا کہ مکے کے جائے امن ہونے کی قدر کا احترام کیا جائے گا۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیر بھی پناہ کے قصد ہی سے مکے گئے تھے۔ اس لئے کہ اس وقت وہ بھی یزید کے خلاف بغاوت کا کوئی فوری منصوبہ ذہن میں نہ رکھتے تھے لیکن امام حسینؑ کا مکے جانا زیادہ توجہ کا متقاضی ہے۔ کوفے میں امام حسینؑ کے ہمنواؤں کی کافی بڑی جمعیت موجود تھی۔ اس لئے مقصود یزید کے خلاف عوامی تحریک چلانا ہوتا تو مکے جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مدینے سے کوفہ کا قصد کیا جاتا۔

دراصل مدینے سے امام حسینؑ اور عبداللہ ابن زبیر کا مکے جانا دمشق کو یہ اشارہ دینا کہ دونوں کے مقاصد پُرامن ہیں۔ عبداللہ ابن زبیر کی حد تک حکومت شام اس اشارہ کو سمجھ گئی اور گو انہوں نے مدینے میں دمشق کے گورنر کی درخواست ملاقات رد کر کے اموی حکومت کی توہین بھی کی تھی تاہم دمشق نے ان کا پیچھا نہ کیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ لیکن حسینؑ کے بارے میں یہ پالیسی اختیار نہ کی گئی— مکے میں حج کے دوران امام کو شہید کرنے کیلئے اموی جاسوس متعین کر دیئے گئے، جبکہ عبداللہ ابن زبیر بھی مکے میں موجود تھے اور دوران حج ان پر بھی قاتلانہ حملہ کیا جا سکتا تھا لیکن عبداللہ ابن زبیر مکے میں موجود رہے اور ان کا کسی نے بال بھی بیکا نہ کیا جبکہ ان کے ٹکڑے اڑا دینے کا مشورہ باپ نے واضح طور پر دے دیا تھا۔

ان پہلوؤں کے پیشِ نظر اب ہم صرف یہ ہی رائے قائم کر سکتے ہیں کہ یزید صرف امام حسینؑ کو شہید کرنے کے لئے ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ سوال یہ نہ تھا کہ امام حسینؑ ایک سیاسی رسک ہیں— مدعا تو پیغمبرؐ اور ان کے خاندان کی تذلیل و توہین اور اس پورے گھرانے کو نیست و نابود کر دینا تھا۔ اگر یوں ہوتا اور ایسا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی کہ

مثلاً آنحضرتؐ کی عمر سن ہجری کے حساب سے ایک سو چار سال کی ہو جاتی اور وہ یزید کی جانشینی کے وقت موجود ہوتے تو بیعت کا مطالبہ آنحضرت ہی سے کیا جاتا تا کہ صحیح تر شخصیت سے انتقام لیا جا سکے۔ اس لئے کہ سارا انتقام پیغمبرِ اسلامؐ سے لینا تھا مگر زمانے کی گردشیں حائل ہو گئیں اور یہ انتقام نانا کے بجائے نواسے سے لیا جا سکا۔

یہ کتاب غیر مذہبی انداز میں لکھی جا رہی ہے ورنہ انداز یہ نہ ہوتا تو اس مرحلے پر ایک مذہبی شخص کو آنحضرتؐ کا ارشاد یقیناً یاد آئے گا۔

''حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں''

متبادل صورتیں

7 ذی الحج 60ھ — ؟ یہ وہ تاریخ ہے جب امام حسینؑ مکے سے کوفے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ امام کے سفر کی آخری کڑی تھی۔ حج سے دو دن پہلے — حج کئے بغیر کوفے کے لئے روانگی حیرت انگیز تھی۔ مکے سے اس غیر معمولی وقت میں روانگی کی وجہ امام نے مکے سے کچھ دور سفر کے دوران فرزند کے سوال پر بتائی۔ امام حسینؑ نے فرمایا:

''اگر میں جلدی نہ کرتا تو وہیں گرفتار کر لیا گیا ہوتا''

یہاں آپ نے غور کیا — ؟ کیا صورتِ حال پیدا ہوئی — ؟ یعنی وہی بات کہ شامی حکومت کی طاقتور ترین سرکاری مشینری صرف امام حسینؑ کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ باپ کو خطرہ تھا صرف چار آدمیوں سے، ان میں سے تین یوں ہی کھلے پھر رہے تھے۔ عبداللہ بن زبیر جن کے ٹکڑے کر دینے کی تاکید امیر شام جیسے نسبتاً محتاط سیاست دان تک ہی نے کی مکے میں موجود تھے مگر کسی نے انہیں گرفتار نہ کیا۔ بس ایک امام حسینؑ تھے جن سے تعارض سنگین سیاسی رسک کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اسی لئے ان کے بارے میں نرمی اور شرافت

برتنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ ان کے خلاف متعدد ممالک پر مشتمل حکومت کی بھیانک سرکاری مشینری بڑی تیزی سے حرکت کر رہی تھی۔

اس سے آپ آخر کیا نتیجہ نکالیں گے —؟ کیا یہ کہ امام حسینؑ حکومت کے وجود کے لئے خطرہ تھے یا حکومت کو پیغمبرؐ اور ان کے خاندان سے چڑ تھی — سب سے بڑا سیاسی خطرہ جس سے تھا وہ تو عبداللہ ابن زبیر تھے۔ جن کے ٹکڑے کر دینے کا پُر زور مشورہ دیا گیا تھا نہ کہ امام حسینؑ جو ڈی فیکٹو حکومت تسلیم کر کے پچھلے 19 سال بلکہ خود یزیدی حکومت کے ساڑھے پانچ ماہ کے دوران بھی محض پُر امن شہری کی زندگی گزارتے رہے تھے۔ کیا ایسے شخص کے بارے میں جن کے 19 سالہ انداز اور طرز عمل نے یہ ثابت کر دیا ہو کہ وہ ڈی فیکٹو حکومت تسلیم کرتے ہیں۔ جس نے معاویہ ابن سفیان کے اسٹیج سے ہٹ جانے کے بعد نئی حکومت کے مضبوط نہ ہونے کی مدت میں جو انقلابیوں کے لئے ہمیشہ سازگار ثابت ہوا کرتی ہے محض خاموش اور پُر امن زندگی گزاری ہو اور اپنے کسی اقدام سے حکومت کی گھبراہٹ کے لیے کوئی عذر مہیا نہ کیا ہو، دمشق کا بوکھلا جانا جائز تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ سوال سیاسی مصالح کا تھا ہی نہیں۔ وجوہ کچھ اور تھیں اور امام حسینؑ ان وجوہ کو پوری طرح جانتے تھے۔ امامؑ نے صورتِ حال کا جو تجزیہ کیا وہ وہی ہے جس پر ہم اور آپ پہنچ رہے ہیں۔ عبداللہ ابن زبیر کے اس مشورے کے جواب میں کہ حسینؑ ابن علیؑ مکے میں قیام فرمائیں۔ خاندان اہلبیتؑ کی نمائندہ شخصیت نے مسائل کا ان الفاظ میں تجزیہ کیا۔ ''خدا کی قسم میں ایک بالشت بھر مکے کی حدود سے باہر قتل کیا جاؤں، یہ مجھے زیادہ پسند ہے بالمقابل اس کے کہ ایک بالشت مکے کے اندر مارا جاؤں اور قسم خدا کی اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں بھی جا کر رہوں تب بھی یہ لوگ مجھ کو وہاں سے باہر لے آئیں گے۔ یہاں تک کہ جیسا چاہتے ہیں

میرے ساتھ سلوک کریں گے۔ خدا کی قسم یہ لوگ تعدی کریں گے جیسے یہود نے یوم شنبہ کے بارے میں ظلم اور تعدی کیا۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے، امام کا صورت حال کے بارے میں کیا تجزیہ تھا۔ یہ تجزیہ اس تاریخی منطق کے پیش نظر بالکل صحیح تھا جو یزید کی شکل میں اپنے آخری نقطے پر پہنچی تھی۔

معروضی اجتماعی حالات کے پیش نظر امام حسینؑ سے پہلے ان کے بھائی امام حسنؑ نے دمشق کی حکومت سے جو ذہنی مساوات قائم کی تھی وہ صرف اس قدر تھی کہ شام کی حکومت کو ڈی فیکٹو حکومت تسلیم کیا جائے اور اگر ڈی جوری تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو کربلا منعقد کردی جائے گی۔ یزید کے باپ تعلقات کی اس نوعیت کو بڑی مشکل کے ساتھ تسلیم کرتے رہے۔ لیکن بیٹا تعلقات کی اس مساوات کو ماننے سے بالکل منکر تھا۔ وہ ہر قیمت پر جارحیت کیلئے مصر۔

اب مسائل کی الجھنیں سلجھ گئی تھیں۔ امیر معاویہ کی موت سے پہلے بڑی حد تک گومگو کی کیفیت تھی۔ مطالبہ بیعت تو تھا تہدید اور تحریص بھی تھی، تاہم انتخاب کی ترازو لٹکی تھی لیکن اب جبکہ دمشق کھل کر میدان میں آگیا تھا تو صورتِ حال میں جو لچک تھی وہ دور ہوگئی — بیعت کسی قیمت پر نہیں۔ موت کی قیمت پر بھی نہیں۔ معروضی حالات، عوامی انقلاب کے لئے سازگار نہ تھے لہٰذا موت بہادری اور شجاعت کے اعلیٰ اصولوں کے ساتھ قبول کی جائے گی۔

حج سے کچھ پہلے امام کو اطلاع ملی کہ دمشق نے انہیں زندہ گرفتار کرنے یا دوران طواف خانہ کعبہ میں نامعلوم قاتلوں کے ذریعے شہید کردینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ دونوں صورتوں میں واضح قباحت تھی۔ گرفتاری کی شکل میں ظلم و عدوان کے تمام ہتھیار استعمال ہوں گے اور اس طرح شہادت کی منزل تک پہنچا جائے گا لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ شہادت تک جم

کر مقابلہ کرنے اور موت کی منزل پر اپنی آبرو کے برقرار رکھنے کے بعد پہنچا جائے۔

اہل بیتؑ کے گھرانے میں موت نے کبھی کسی پریشان کن بدل کی حیثیت اختیار نہ کی تھی۔ اصول یہ تھا کہ — ''کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہٗ ما نیست'' بنیادی حیثیت اصولوں کو حاصل تھی، زندگی کو نہیں۔ بلاشبہ زندگی ایک مثبت قدر ہے اور اس لئے اہم اور قابلِ تحفظ۔ امام حسینؑ نے اس قدر کا خیال کافی مدت رکھا تھا اور دمشق کو طویل عرصے یہ موقع دیا کہ وہ اصولوں کی آخری حد کو پار نہ کرے تو فیصلہ کن مرحلے سے بچا سکے گا مگر اب کہ — فیصلے کی گھڑی — آ گئی تھی، تو حسینؑ نے متبادل صورتوں میں سے اس سب سے زیادہ بہتر صورت کو چن لیا جوان کی شہادت کے واقعے کو معقولیت پسندی۔ ہوش مندی اور اخلاقی اقتدار کے احترام اور اصول نوازی کی علامت بن جانے کا باعث بن گئی۔ اپنی آزادی کی قربانی دے کر دوسروں کے مظالم کی زد میں اور موت کی آغوش میں چلا جانا جبکہ مقابلہ کرنے اور بہادروں کی طرح میدان گرم کرنے کا امکان موجود ہو، لازماً صحیح راستہ نہ تھا۔ پھر یوں سادگی میں کسی وحشی کے خنجر کا نشانہ بن جانا بھی معقول طریقہ نہ تھا درجہ شہادت پر فائز ہونے کا۔ پھر ان دونوں صورتوں میں سنگین قباحت یہ تھی کہ امن کی ایک محترم علامت یعنی مکے کی حرمت داؤ پر لگتی تھی۔

امن کی علامت

مکہ امن کی علامت تھا۔ اس علامت کی بے حرمتی دو سال بعد ہونی تھی۔ اب تک اس مقدس قدر کو سب نے احترام کی نظر سے دیکھا تھا اور کسی نے اسے توڑنے کی جرأت نہ کی تھی۔ یہ جرأت یزیدی فوج کو کرنا تھی، لیکن اس جرأت کے عملی جامہ پہننے سے پہلے مناسب عذر پیدا ہونا ضروری تھا۔ خاندانِ اہل بیتؑ کے قائد نے جو اصول نوازی اور

اخلاقی اقدار کے نمائندے تھے، ایک اصولی جدوجہد کو یہ عذر بننے دینے سے انکار کر دیا۔
اس لئے امامؑ نے کہا کہ —

''خدا کی قسم میں ایک بالشت بھر مکے کی حدود سے باہر قتل کیا جاؤں، یہ مجھے زیادہ عزیز ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ ایک بالشت مکے کے اندر مارا جاؤں۔''

سوال شہید ہونے کا نہیں تھا شہادت تو کوئی مشکل بدل تھی ہی نہیں بشرطیکہ بنیادی تہذیبی قدریں خطرے میں پڑ گئی ہوں مگر سوال شہادت پیش کرنے کی جگہ — طریقے اور وقت کے انتخاب کا تھا۔ تاریخ میں بہت سے لوگوں نے شہادت پیش کی ہے، مگر شہادت کیلئے وقت، حالات، ڈرامائی ماحول اور اخلاقی اقدار کے انتخاب میں امام حسینؑ نے باریک بینی اور شرافت نگاہی نیز صحیح تر فیصلوں کی جو طویل کڑیاں مہیا کی ہیں ان کی مثال تاریخ کے دوسرے ایسے حوادث میں نہیں ملتی۔

امام حسینؑ کے سامنے شہید ہو کر جنت میں کچھ نئے محل حاصل کرنے کا سوال نہ تھا۔ ورنہ حج کے دوران یا مکے میں شہادت ہی بلکہ خود حج میں شرکت ہی اپنا ثواب ہی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کافی تھا۔

کون مسلمان ہے جو یہ دعا نہ کرتا ہو کہ اسے دوران حج مر جانے کی سعادت نصیب ہو۔ امام حج اور عبادات کے جتنے شائق تھے اس کا سب کو علم ہے لیکن یہ سطح تو ایک عام آدمی کی سوچ کی سطح ہے۔ جو بنیادی، تہذیبی و انسانی اقدار کی ترجیحی درجہ بندی سے آگاہی نہیں رکھتا۔ حسینؑ اس گھر کے نمائندے تھے جس کے سربراہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ:

''میں اخلاق کی بلندیوں کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔''

حسینؑ غیر معمولی پختہ شعوری اور بالغ نظری کے حامل تھے۔ ان کے سامنے انسانی

تہذیب کے اساسی مسائل تھے جن کو دمشق کے حکمران سمجھنے سے یکسر محروم رہے۔ ان حالات میں بڑے پھونک پھونک کر قدم اٹھانا ضروری تھا تاکہ ذرائع مقاصد کا تقدس پامال نہ ہو جائے، کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے کسی درجے کی قدر پر زد پڑے۔ مکے میں شہادت ڈھیر سارے ثواب کا سبب تو بن جاتی مگر تاریخ کو اس المیے سے محروم کر دیتی جو اعلیٰ تہذیبی و اخلاقی اقدار کے تحفظ کا سب سے بڑا سنگِ میل بن گیا اور جس نے پوری تاریخ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اب واقعات کا سلسلہ ایک نئے دوراہے پر آ کھڑا ہوا۔ دمشق نے معقولیت اور ہوش مندی کی تمام حدود کو پھاند کر تاریخِ نسل انسانی کا ایک سنگین ترین گناہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس لئے امام حسینؑ کے سامنے ایک بدل رہ گیا تھا — بہادری کے ساتھ موت کا سامنا کرنا اور جنگ مغلوبہ لڑنے کے لئے تمام ممکن انقلابی قوتوں کو مجتمع کرنا۔ کوفے کی پیشکشیں موجود تھیں۔ یہ پیشکشیں اخلاقی قدروں سے وابستگی کے مختلف درجوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ اس بات کی قابلِ اعتماد تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ پیشکشیں کرنے والوں کی بہت بڑی اکثریت یہ باور کرتی تھی کہ ان کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ جب کہ امام حسینؑ پوری طرح جانتے تھے کہ مسلم معاشرے کی سیاسی اور سماجی صورت حال کسی انقلابی تحریک کی کامیابی کے لئے موزوں نہیں ہے — تاریخ میں امامؑ کے ایسے اقوال بکھرے پڑے ہیں کہ دمشق کے مطالبے سے انکار کے معنی طے شدہ طور پر موت کے ہوں گے اور اس انقلابی تحریک کا منطقی نتیجہ شہادت کی شکل میں برآمد ہوگا۔

کوفے کے انقلابیوں نے جو خطوط لکھے تھے وہ امام حسینؑ کے کسی خط کے جواب میں نہ تھے بلکہ واقعہ یہ ہے امامؑ نے اپنی طرف سے ایک یا زیادہ سے زیادہ دو خطوط اس تمام مدت میں لکھے تھے جو 26 رجب بیعت کے مطالبے کے سامنے آنے اور 10 محرم کی شام

کے دوران گزری تھی اور جن میں اپنا ساتھ دینے کے لئے کہا گیا تھا اور یہ خطوط بھی اپنی محترم بہن جناب زینبؑ کے اصرار پر لکھے گئے تھے۔ ورنہ کوفے کے انقلابیوں کو جو خطوط گئے وہ صرف ان پے درپے خطوط کے جواب میں تھے اور جو اکابر کوفہ نے امامؑ کو لکھے تھے۔

خطوط — یعنی وہ پیغام جن میں دمشق کی حکومت کے خلاف انقلاب لانے کے لئے کہا گیا ہو بلکہ بات پانچ چھ مہینے یعنی یزید کی حکومت کی نہیں، حسنؑ اور معاویہ معاہدے کے بعد سے لے کر شہادت کے دن تک امام حسینؑ نے کوئی ایسا خط — پیغام یا مراسلہ کسی کو نہیں لکھا جس میں دمشق کے خلاف بغاوت کے لئے کسی کو اکسایا گیا ہو۔ اس لئے امام حسنؑ کے معاہدے کے وجود میں آنے کے معنی ہی یہ تھے کہ مسلم معاشرہ اخلاقی اقدار کے تحفظ کیلئے انقلاب لانے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔ مسلم معاشرے کی اسی زوال آمادہ صورت حال کے پیش نظر امام حسنؑ کو دمشق کی قدر شکن حکومت سے مفاہمت کرنی پڑی تھی۔

ایران کی صفوی حکومت کے بانی شاہ اسماعیل صفوی کے علاوہ انقلاب کے روح رواں — لینن — تاریخِ انسانی کے انقلابیوں میں سب سے بڑے انقلابی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا بھر کے انقلابیوں کو لینن نے مشورہ دیا تھا کہ انقلاب کے دوران جدوجہد کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ دو قدم آگے بڑھا جائے، تو ناسازگار صورت حال میں ایک قدم پیچھے بھی ہٹ لیا جائے یعنی انقلابی حالات ناپختہ ہوں تو پیچھے ہٹنے میں اہانت خیال نہ کی جائے۔

لینن سے ملتا جلتا مگر ذرا زیادہ وسیع الاطلاق مشورہ روم کے شہنشاہ اور عظیم فلسفی مارکس آری لیئس نے دیا تھا۔ آری لیئس نے پاکیزہ روحوں کو یہ فلسفیانہ صلاح دی تھی کہ معاشرے کے اشتعال انگیز بگاڑ کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرو اور حالات کے اخلاقی انحطاط پر جو غصہ پیدا ہوا سے ضبط کرنے کی اہلیت کو بڑھاؤ۔ آری لیئس کے خیال

میں ایک اصلاح پسند شخص کو معاشرے میں مختصر سی اصلاح پر قناعت کر لینی چاہیے۔

اس فلسفیانہ سوجھ بوجھ پر عمل کرنے میں علیؑ کے دونوں بیٹوں اور پیغمبر اسلامؐ کے نواسوں حسنؑ اور حسینؑ نے جس غیر معمولی تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کیا ہے وہ ہر اعتبار سے حیرت انگیز ہے۔ انقلابی تحریک کا جذبہ عام طور پر بڑا پاکیزہ جذبہ ہوتا ہے لیکن ہر مرحلے پر یہ جذبہ ہوش مندانہ ہی ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ معاشروں کا صحیح سائنسی تجزیہ ان پُر جوش حضرات میں خال خال ہی پایا گیا ہے۔ جو خیر نوازی کے جذبے سے حالات کو بدلنا چاہتے ہیں۔

امام حسینؑ نے مارکس آری لیئس اور لینن سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر انسانوں کو یہ راستہ بھی سمجھایا ہے کہ ناقابلِ اصلاح معاشرے کے بگاڑ پر تحمل کا مرحلہ کہاں تک چلتا ہے اور شہادت کی منزل کس نقطے پر آتی ہے، پھر مزید ایک قدم اور آگے بڑھ کر حسینؑ نے یہ بھی بتایا کہ شہادت کو بندشوں کے زیور سے کس طرح سجایا جاتا ہے۔ حسینؑ نے شہادت کو ایک واقعہ کی بجائے ایک آرٹ میں بدل دیا جس میں حیرت انگیز اخلاقی نفاستیں بڑی خوبی سے ایک نگینے میں جڑی ہوئی ہیں۔

موت اور آرٹ

مکے میں اب امام کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ تاریخ کی دو متحارب قوتوں کے درمیان دوٹوک مقابلہ کہاں ہو۔ سوال موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا نہ تھا۔ سوال موت کو ایک بھرپور آرٹ کے طور پر استعمال کرنے کا تھا۔ مکے میں موت تو آسکتی تھی مگر وہ ایشوع واضح نہ ہو سکتے تھے جو تاریخی اطلاق اور تہذیبی اہمیت کے حامل تھے۔ مشکل یہ تھی کہ امام مسائل کو جس سطح پر طے کر رہے تھے دوسروں کی نظر مسئلوں کی ان باریکیوں پر نہ پہنچ سکتی تھی۔ عوام کی سوچ اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کو تاریخی بہاؤ میں رکھ کر برتنے کی سوچ میں ہم

آہنگی پیدا کرنے کا مسئلہ سامنے تھا۔ ایک طرف کوفے کے انقلابیوں کے مطالبات اور اصرار کا مسئلہ تھا۔ محمد حنفیہ اور عبداللہ ابن عباس جیسے بزرگوں کے ذاتی سلامتی کے بارے میں مشورے تھے اور دوسری طرف امام حسینؑ کی نظر تھی جو اس تہذیبی دھماکے کو دیکھ رہی تھی جسے زیادہ سے زیادہ مؤثر اور آرٹسٹک بنانے کیلئے ہر قدم کو اخلاقی اقدار کی ترازو میں تولنا تھا۔

قدرتاً رہنمائی و ہدایت کے اس مطالبے کو رد نہ کیا جاسکتا تھا جو کوفے والوں کی طرف سے آیا تھا۔ اسی طرح محبت اور خلوص کے اس اظہار کو تلخی سے نہ مسترد کیا جاسکتا تھا جو مثلاً محمد حنفیہ نے بچوں اور عورتوں کو ساتھ نہ لے جانے کا مشورہ دے کر کیا تھا، لیکن اس علم و ذہانت کے باوصف جو محمد حنفیہ میں پایا جاتا تھا، تاریخِ تہذیب کا وہ بالغ شعور جس کی سطح پر امام مسائل سے نمٹ رہے تھے، ان حضرات کی سوچ کی پہنچ سے بالاتر تھا جو مشورے دے رہے تھے۔

جسمانی و مادی فتح کا منصوبہ سامنے ہوتا تو بچوں اور عورتوں کو ساتھ لے جانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ ایسے میں اسلحہ کے ذخائر ساتھ ہوتے۔ گوریلا دستے آزمودہ کار فوجی اور انقلابی ولولہ رکھنے والے تمام وہ حضرات ہم رکاب چلتے جنہیں اس جدوجہد سے دلچسپی تھی پھر پہلے سے ان جیسے افراد کو ساتھ ملانے کی تدابیر کی جاتیں۔ خطوط بھیجے جاتے، پیغامبر روانہ کئے جاتے اور یوں بڑے سے بڑے لشکر کی تیاری کا پورا بندوبست کیا جاتا مگر یہاں کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ اس لئے کہ مسلم معاشرہ اس نوع کی جدوجہد کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ لے دے کے اہلِ کوفہ نے اپنے انقلابی عزم کا اظہار کیا تھا۔ سو جوابدہی کے پیش نظر نہ بالکل منطقی تھا کہ ان کی اپیل کو عمل کی کسوٹی پر پرکھا جائے نہیں۔! حسینؑ کو اس اقدام کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اس انقلابی ابال میں وہ طاقت موجود نہیں ہے جو

اخلاقی قدروں کے تحفظ کی جدوجہد کے لئے درکار ہوتی ہے، تاہم غیر جانبدار مبصرین کو یہ دکھانے کے لئے کہ اصل صورتِ حال کیا ہے مذکورہ اپیل کو توجہ کا موضوع بنانا ضروری ہو گیا چنانچہ اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو اہلِ کوفہ کی اپیل کو عمل کی ترازو میں تولنے کے لئے امام نے کوفے روانہ کر دیا۔

کوفیوں کے طرزِ عمل کے بارے میں تاریخ میں بڑی لے دے کی گئی ہے اور نکتہ چینی جزوی طور پر صحیح بھی ہے لیکن صرف جزوی طور پر، کلی طور پر نہیں۔ بات اگر عام انقلاب کی ہوتی۔ ایک ایسے انقلاب کی جس میں ہر طریقے پر حکومت کو اکھاڑ پھینکنا مقصود ہوتا ہے تو کوفے کی انقلابی تحریک کی کامیابی کے امکانات کافی روشن ہوتے لیکن یہ تحریک جس کی نسبت امام حسینؑ سے تھی ایک مختلف انداز کی تحریک تھی۔ یہاں انقلاب کو اہمیت حاصل تھی، مگر ہر قیمت پر نہیں — انقلاب مگر اچھے ذرائع سے — کا اصول اس تمام تحریک میں بنیادی اصول کے طور پر موجود تھا۔ ظالم حکومت کا تختہ الٹنا ایک اچھا مقصد ہے مگر سوال یہ ہے، کیا اس مقصد کے حصول کیلئے اچھے اور بُرے وسائل سب ہی استعمال میں آسکتے ہیں۔ عام انقلابوں میں وسائل کا اچھا یا بُرا ہونا اہمیت کا حامل نہیں ہوتا لیکن اس تحریک میں مقصد کے ساتھ وسیلے کو اساسی اہمیت حاصل تھی اور اس لئے یہاں صورت حال مختلف تھی۔

حکومتیں عام طور پر اور دمشق و کوفے کے حکمران خاص طور پر ہر خانے پر کھیلنے کے عادی تھے۔ وہ اخلاقی اقدار کی لاشوں سے بہ آسانی گزر جاتے تھے اور اس لئے عمل کا کوئی خانہ ایسا نہ تھا جو ان کے لئے بند ہو لیکن امام حسینؑ کے کیمپ میں ہر کھیل اخلاقی حدود کے اندر کھیلا جا سکتا تھا۔ یہاں سوال مادی جیت کا نہ تھا بلکہ اہمیت اخلاقی اقدار کو حاصل تھی۔ جن پر عمل بجائے خود مقصد تھا۔ اس لئے واضح طور پر وہ کامیابی کا مفہوم یہاں اطلاق نہ رکھتا تھا

جو غیر محتاط بادشاہوں کے یہاں سمجھا جاتا ہے۔

سقراط رشوت دے کر بچ نکلنے کا مشورہ مان لیتا تو چند سال اسے اور زندہ رہنے کا موقع تو ضرور مل جاتا مگر تاریخ ایک با اصول فلسفی کے عظیم کارنامے سے محروم رہ جاتی۔

کوفے کے انقلابیوں کی اکثریت ہر قیمت پر کامیابی کے جانے بوجھے طریقوں پر چلنے کے لئے میدان میں اتری تھی۔ بہت کم تھے ایسے جو اخلاقی حدود کے اندر رہ کر انقلاب کا کھیل کھیلنے کو تیار ہوں۔ اس لئے بہت کم لوگ ایسے نکلے جو اخلاقی اقدار کی چھلنی سے چھن کر شہادت کے درجے پر پہنچ سکے۔

اور......اگر

کربلا کی تمام تاریخ بدل جاتی اگر— اور یہ اگر بڑی فیصلہ کن ہے— حضرت مسلمؑ اخلاقی حدود کو توڑ کر ابنِ زیاد کو جب کہ وہ نہتے ایک ایسے گھر میں ان کے قبضے میں آگئے تھے جب کہ وہ اپنی فوج کے ایک بڑے افسر جناب ھانی ابن عروہ کے گھر میں ان کی عیادت کے لئے آیا تھا اور ھانی نے حضرت مسلمؑ سے طے کیا تھا کہ وہ مکان کے ایک کمرے میں مسلح ہو کر بیٹھ جائیں اور ان کے بعض اشاروں کو سن کر نہتے ابنِ زیاد کو آ کر قتل کر دیں۔ حضرت مسلمؑ مسلح تھے۔ ابنِ زیاد نہتا تھا۔ گھر خالی تھا اور ھانی ابنِ زیاد کے قتل پر مصر، مگر حضرت مسلمؑ نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا اور اپنے اقدام کے جواز میں ایک حدیث پیش کی۔ بالفاظ دیگر صاحب مکان کی اس شکایت پر کہ انہوں نے اس نادر موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا حضرت مسلمؑ کا جواب یہ تھا کہ اخلاقی اقدار اس جیسے اقدام کی راہ میں حائل تھیں واضح رہے— یہ مشترکہ دوست وہی ھانی ابن عروہ تھے جو بعد کو ابنِ زیاد کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ کربلا کے المیے کا یہ انقلابی نقطہ تھا کہ اگر اس وقت ابنِ زیاد،

مسلم بن عقیلؑ کے ہاتھوں مارا جاتا تو واضح طور پر تاریخ مختلف انداز پر چلتی — لیکن یاد رہے — یہ — اگر — اضطراری نہیں ہے، انتخابی ہے یعنی یہ اگر — اس مفروضے پر مبنی نہیں ہے کہ مثلاً ابنِ زیاد کوفے پہنچتے ہی کسی حادثے کا شکار ہو جاتا بلکہ ایک شخص کے شعوری فیصلے کا نتیجہ ہے۔ خود واقعات کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ مسلم بن عقیلؑ کا یہ فیصلہ کہ ابن زیاد کو نہتا اس مکان میں قتل کر دینا اخلاقی اقدار کے خلاف ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد کیا گیا تھا۔ ھانی ابن عروہ نے قتل کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کے تحت حضرت مسلمؑ کو ابنِ زیاد کے آنے کے وقت ایک کمرے میں چھپ جانا تھا۔ ابتداء میں حضرت مسلمؑ اس سے متفق تھے، ہر چند تذبذب کے عالم میں تھے چنانچہ منصوبے کے بالکل آخری نقطے کے پہلے تک کے مراحل میں، وہ طے شدہ منصوبے کے تحت ہی اقدامات کرتے رہے جس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت مسلمؑ، ابنِ زیاد جیسے بدترین مگر اس تمام قضیے کے اہم ترین رکن کو راستے سے ہٹانے کی فیصلہ کن حیثیت کو پوری طرح جانتے تھے اور اس لئے انہوں نے بالکل آخری منزل تک اپنے اقدامات کو اخلاقی اقدار کے معیار پر قابلِ اعتراض خیال نہ کیا لیکن جب انہوں نے اس منصوبے میں خود اپنے کردار کا جائزہ لیا تو یہ بات بالکل نہ بھائی کہ ایک نہتے شخص کو چاہے وہ ابنِ زیاد جیسا شخص ہی کیوں نہ ہو، جو عیادت کے لئے کسی کے گھر آیا ہو یوں آدگی میں قتل کر دیا جائے۔ ان کی طبیعت، مزاج اور شعور نے اس اقدام سے اباء کیا اور اس لئے انہوں نے عملی اعتبار سے اس سنہری موقع کو جان بوجھ کر جانے دیا۔

مسائل کو تولنے کا پیمانہ اگر خالص ذاتی و عملی فوائد ہوں اور اخلاقی قدروں کے پیمانے کو ملحوظ نظر نہ رکھا جائے تو مسلم کے اس اقدام کو سنگین سہو اور فرو گزاشت سے تعبیر کیا

جائے گا یعنی ایک فروگزاشت جس نے مآلِ کار اس مادی کامیابی میں فیصلہ کن رول ادا کیا جو دمشق کو کربلا میں حاصل ہوئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم مسائل کو کس سطح پر لیتے ہیں۔ تاریخ میں ایک انداز یہ رہا کہ بنیادی تہذیبی واخلاقی اقدار پر جب براہ راست زد پڑ جائے تو فرد کی اپنی زندگی داؤ پر لگا دینی چاہیے۔ سقراط نے اس اصول کو بڑی خوبی سے نبھایا تھا۔ حسینؑ کے یہاں بھی مسائل اسی طرح پر طے ہو رہے تھے جبکہ دوسری اور عمومی سوچ یہ رہی کہ وقتی ذاتی فائدوں کے لئے اخلاقی قدروں کی لاشوں سے گزر جانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ تاریخ کے زیادہ تر بڑے فاتح اور کامیاب مادی زندگی گزارنے والے افراد کی اکثریت اور عوام کی بڑی تعداد مسائل کو اسی عینک سے دیکھتی ہے۔ اب اگر اس نہج سے آپ سوچ شروع کریں تو بلاشبہ مسلمؑ نے ایک انتہائی سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے دیا لیکن کیا — تاریخ کے باشعور لوگوں سے آپ سوال کریں — انسانی نسل کی داستان جنگلی جانوروں کے چیر پھاڑ کے قصوں کا مجموعہ بن کر نہ رہ جاتی، اگر تاریخ ان لوگوں کے نام سے خالی ہوتی جنہوں نے تہذیب کی بنیادی قدروں کے تحفظ کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔

ھانی ابن عروہ کے گھر کے واقعے کو یوں سرسری طور پر پڑھ کر آگے نہ بڑھیے۔ اس لئے کہ یہ حسینؑ کی کربلا کے المیہ ڈرامے کا نہایت اہم اور بے حد مرکزی ایکٹ ہے۔

بات کو اس مفروضے سے سوچیے کہ امام حسینؑ دمشق کے تخت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ سامنے رکھتے تھے۔ تختِ حکومت پر نئے حکمران کے بیٹھنے کا وقت حکومت کی کمزوری کا وقت ہوتا ہے۔ لہٰذا امام حسینؑ نے اس وقت سے فائدہ اٹھا کر دمشق کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ آپ کہیں گے یہ مفروضہ ان واضح شہادتوں کے خلاف ہے جن پر اب تک ہم سوچتے رہے لیکن ان شہادتوں کو فی الحال نظر انداز کر کے اور یہ فرض کر کے سوچ کو آگے

بڑھائیں کہ امام حسینؑ حکومت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ سامنے رکھتے تھے تو واضح طور پر اگر منصوبہ یہی تھا تو امامؑ نے مسلم بن عقیلؑ کو یہ ہدایت کی ہوگی کہ وہ کوفے پر قبضہ کرلیں۔ گویا مسلمؑ کے سپرد کوفے کی حکومت چھین لینے کا مشن کیا گیا تھا یعنی مشن یہ تھا کہ وہ ابنِ زیاد کو جو بصرے کے ساتھ کوفے کا بھی گورنر تھا قتل کردیں تاکہ اس کی فوج تتر بتر ہو جائے اور یہ دو اہم تر اور مرکزی علاقے حضرت مسلمؑ کے قبضے میں آجائیں۔ مشن اگر یہی تھا تو جب ھانی کے گھر میں نہتا ابنِ زیاد جال میں پھنس گیا تھا اور کوفے اور بصرے کی حکومت طشتری میں رکھ کر حضرت مسلمؑ کے سامنے پیش کردی گئی تھی ابنِ زیاد کا قتل کردینا ضروری تھا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر حضرت مسلمؑ کوفے اور بصرے پر قبضہ کرنے کا منصوبہ ساتھ لے کر چلے تھے تو جاسوسوں کو ابنِ زیاد کو زہر دینے یا اندھیرے اجالے میں قتل کردینے کے لئے بھیج دیتے۔ ابنِ زیاد کی شخصیت فیصلہ کن تھی اس تمام معاملے میں وہ مار دیا جاتا تو امام حسینؑ آدھی جنگ جیت گئے تھے یقیناً اس کے بعد بھی ہار کا خطرہ موجود تھا لیکن واضح طور پر جیت کا وہ امکان جو ایک فیصد بھی نہ تھا، پچاس فی صد پیدا ہو جاتا پھر غیر متوقع صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ خود صیاد جال میں پھنس گیا تھا۔ ابنِ زیاد کی زندگی حضرت مسلمؑ کے قبضے میں تھی۔ ان کی تلوار کا ایک وار کوفے اور بصرے پر اقتدار اور بنیادی تہذیبی قدروں کے درمیان حائل تھا۔ ان کی تلوار چل جاتی تو کوفے اور بصرے کی حکومت ان کے قدموں میں آ گری تھی لیکن ساتھ ہی اعلیٰ اخلاقی اقدار بھی ذبح ہو جاتیں اس وقت بڑا مشکل فیصلہ درپیش تھا۔ ابنِ زیاد کا قتل تاریخ کا رخ بھی بدل سکتا تھا۔ اس لئے ھانی ابن عروہ نے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ ابنِ زیاد کا قتل ایک اچھا کام ہوتا لیکن اس سے بھی اچھا کام ایک اور تھا اور وہ تھا اعلیٰ اقدار کا احترام اور اس احترام کے پیشِ نظر ایک نہتے شخص کو جو گھر عیادت کرنے آیا ہوا ڈگی

میں مار دینے سے احتراز ضروری تھا— ابنِ زیاد جیسے کلیدی شخص کو راستے سے ہٹا دینا دور رس اثرات کا حامل تھا۔ سیاسی طور پر یہ بے حد مفید، انتہائی فیصلہ کن اقدام ہوتا۔ اس لئے بالکل قدرتی تھا کہ حضرت مسلمؑ نے فوری طور پر اس منصوبے سے اتفاق کر لیا اور منصوبے کے ابتدائی حصے کی تکمیل کیلئے مسلح ہو کر کمرے میں انتظار کرنے کے لئے چلے گئے۔ انتظار کے اس وقفے میں انہوں نے منصوبے کو شعوری سطح پر پرکھا تو اس میں اس اچھے مقصد کے لئے نازیبا وسائل کے استعمال کا سوال سامنے آیا۔ آنحضرتؐ کی ایک حدیث یعنی ایک اعلیٰ اخلاقی اقدار اس اقدام کی راہ میں حائل ہو گئی اور اس لئے فوراً حضرت مسلمؑ نے اپنا فیصلہ بدل ڈالا اور ابنِ زیاد کو زندہ واپس جانے دیا۔

واضح اس سے کیا ہوا؟ واضح اس سے یہ ہوا کہ حضرت مسلمؑ کو جو ذمہ داری سونپی گئی تھی اس میں یہ شرط بالکل صاف تھی کہ کوئی قدم اعلیٰ اخلاقی اقدار کے خلاف نہ اٹھایا جائے۔ ابنِ زیاد جیسے ظالم اور بدترین شخص سے معاملات میں بھی اخلاقی اقدار کا احترام پیش نظر رکھا جائے۔ چاہے اس کے نتیجے میں مادی شکست سے دوچار ہی کیوں نہ ہونا پڑ جائے۔

مطلب یہ کہ حسینؑ کا نمائندہ تخت کوفہ و بصرہ پر قبضہ کرنے کیلئے روانہ نہیں ہوا تھا، اس لئے کہ امامؑ کے سامنے تخت پر قبضے کا منصوبہ تھا ہی نہیں۔ ہوتا تو اخلاقی قدروں کے احترام کے بجائے ان اقدامات کو اہمیت دی جاتی جو جنگ جیتنے کے لئے مفید ہوتے اور ابنِ زیاد کا راستے سے ہٹانا سب سے مفید تر اور مؤثر اقدام تھا، مگر یہ اقدام اس لئے نہ کیا گیا کہ مقصود حکمرانی نہ تھا بلکہ ایک ظالم حکومت کے مظالم سے حتی الامکان بچنے، اور یہ ممکن نہ ہو تو بہادری کے ساتھ حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے جان دے دینا پیش نظر تھا یہی کچھ کربلا میں ہوا۔ یہی کہانی کوفے میں پیش آئی تو یوں آپ نے دیکھا کہ یہ مفروضہ کہ حسینؑ تخت دمشق پر قبضے کا منصوبہ سامنے رکھتے تھے اس واقعے کے جائزے سے صحیح ثابت نہیں ہوتا۔

ایک سو بانوے گھنٹے

کربلا کا سانحہ جو 53ھ سے جب یزید کے باپ نے اپنے بیٹے کو جانشین بنانے اور امام حسینؑ سے بیعت لینے کا مطالبہ پیش کیا تھا تاریخ کی اوپری سطح پر تو ابھر آیا تھا مگر فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہ ہوا تھا۔

دوسری محرم کو جب امام حسینؑ کا قافلہ کربلا کی سرزمین پر وارد ہوا تھا۔ تاریخ ایک بالکل نئے دور میں داخل ہوگئی۔ وقت کی رفتار سست پڑگئی اور وہ 192 گھنٹے جو امام کے وارِدِ کربلا ہونے اور حادثۂ شہادت کے رونما ہونے کے درمیان گزرے — تاریخ کے ایک طویل دور میں بدل گئے۔

حضرت مسلمؑ نے غیر اخلاقی عملی فوائد کے ایک سنہری موقع کو چھوڑنے کا جو یادگار قدم اٹھایا تھا کربلا میں امام حسینؑ کے ورود پر ایک اسی انداز کا دوسرا واقعہ رونما ہوا — فرات کے پانیوں پر امام حسینؑ کی محدود سی فوج نے قبضہ کرلیا تھا اور حر، یہاں کے بے رحمانہ نقطہ نظر کے تحت یہ سمجھا تھا کہ اس نوع کے ہتھیار کا استعمال جائز ہے یعنی یہ کہ یزیدی فوج کو پانی کی رسد نہ پہنچنے دی جائے — لیکن یہاں بھی بات اخلاقی قدروں کی آ پڑی اور امام حسینؑ نے وہی بدل چنا جو ان کے حلقے کا طے شدہ انداز تھا۔ یزیدی فوج کو پانی کی رسد بحال رکھی گئی۔ سوچ کا یہ وہی طرز ہے جو ایٹمی ہتھیاروں اور زہریلی جراثیم کی جنگ پر پابندیاں لگانے کے سلسلے میں ایک طاقتور تحریک کی شکل میں آج کل سامنے آیا ہے۔

واقعات کی اس عجیب ستم ظریفی کو دیکھئے کہ امام حسینؑ نے جو سہولت یزیدی فوج کو مہیا کی تھی، ابنِ زیاد کے لشکر نے حسینؑ کے قافلے کو ٹھیک اسی سہولت سے محروم کردیا۔ وہی پانی امام حسینؑ کے ساتھیوں پر چند دن بعد بند کردیا گیا جو یزید کے لشکر کیلئے کھول دیا گیا تھا۔

یہ اصل مسائل کے بارے میں اپروچ (approach) کا فرق تھا۔ امام حسینؑ کے یہاں مسئلے دوسری ترازو میں تل رہے تھے جبکہ دمشق اور کوفے کے حکمراں چیزوں کو بالکل مختلف سطح پر رکھتے تھے۔ سوچ کا یہ فرق دراصل سینسی بیلٹی (حسیت) کا فرق ہے۔ ناتراشیدہ حسیت (سن سیبلیٹی) یہ ہے کہ جنگ چھڑے تو پھر ہر وحشیانہ ظلم ڈھانے کی رخصت لے لی جائے جبکہ تربیت یافتہ حسیت کا تقاضا یہ ہے کہ جنگ کو جو بجائے خود ایک وحشیانہ حرکت ہے مجبوراً لڑا بھی جائے تو چند ممکن آداب کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ مہلک جراثیم والے ہتھیار استعمال میں نہ لائے جائیں۔ شہریوں پر بمباری نہ کی جائے۔ شفا خانوں اور عبادت گاہوں کونشانہ نہ بنایا جائے۔

واضح طور پر یہ وہی سوچ ہے جو مکے کو دارالحرام اور جائے پناہ بنانے کا سبب بنتی ہے۔ دراصل حسینؑ اور یزید دو مختلف سن سی بلیٹیز دو جداگانہ حسیتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سوچ اور ردعمل کے دو مختلف دھارے ہیں جو جدا جدا بہہ رہے ہیں۔

لیکن فرات سے یزیدی فوج کو پانی حاصل کرنے کی اجازت دے دینا جہاں مختلف حسیت کی نمائندگی کرتا ہے، اس کا ایک بڑا اہم سیاسی پہلو بھی ہے۔ گڑبڑ ساری یہ ہے کہ امام حسینؑ کے یہاں مسائل کو سیاسی انداز پر برتنے کی جو سطح تھی، دمشق اور کوفے والے اس سیاست کو سمجھنے کے بارے میں بعید تر فاصلوں پر آنے کی اہلیت سے محروم تھے۔

دریائے فرات سے یزیدیوں کو روکنے کا مطلب واضح طور پر یہ ہوتا کہ پانی کے حصول کی جنگ چھڑ جاتی۔ شہادت اس تصادم میں بھی دی جا سکتی تھی۔ جس طرح اس سے پہلے مکے میں شہادت پیش کرنے کے تمام امکانات پیدا ہو گئے تھے مگر فرات پر قبضے کی لڑائی یعنی پانی کے حصول کی لڑائی اس ایشو کی دوٹوک لڑائی نہ ہوتی، جس کے لئے حسینؑ اپنی قربانی

پیش کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور جو تاریخ گیر ایشو تھا، مکے میں شہادت بھی متعین، واضح اور صاف ایشو پر رونما نہ ہوتی، ایک دہشت گرد کا حملہ ہوتا جس سے امام حسینؑ شہید ہو جاتے۔ بیعت جیسے تاریخی سوال پر واضح اور کھلے انداز میں قربانی پیش کرنے کا جو مقصد سامنے تھا وہ پورا نہ ہوتا۔ یوں پوری بات دھندلا کر رہ جاتی۔ اس لئے تہذیبی بہاؤ پر نظر رکھنے والے ایک سیاست داں کی طرح امام نے پانی پر قبضے کی اس جنگ کو 10 محرم کے لئے ٹال دیا تاکہ تاریخ ایک فیصلہ کن المیے اور ڈرامے کو پوری وضاحت کے ساتھ دیکھ سکے۔

تاریخ جوں جوں 10 محرم کے قریب ہوتی چلی گئی۔ حسینؑ نے ایک المیہ ڈرامے میں گہرے رنگ بھرنا شروع کر دیئے۔ انہوں نے 9 اور 10 محرم کی رات میں اپنے اعزاء اور ساتھیوں کا جلسہ کیا جس میں چراغ گل کر دیئے گئے تاکہ بالمشافہ بات چیت کے دباؤ سے لوگ بچ جائیں۔ امام حسینؑ نے حاضرین سے کہا۔ یہ لوگ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ آپ لوگ اس رات کی تاریکی میں جہاں چاہیں چلے جائیں اور — اس مرحلے پر اپنے پرائے کا جو رجحان خود غرضی سے پیدا ہوتا ہے اور کردار کی بلندی پر داغ لگا دیتا ہے اس کا کوئی ہلکا سا پرتو بھی دور کرنے کے لئے امامؑ نے فرمایا — یہی مشورہ اپنے اعزاء کو بھی ہے کہ وہ رات کے اندھیرے میں اپنی جان بچا لیں۔ حسینؑ کے اعزاء اور ان کے ساتھی واضح طور پر ان ہی اخلاقی اقدار کو عزیز رکھتے تھے جو امامؑ کو عزیز تھیں۔ اس لئے اس پیشکش کو کسی نے قبول نہیں کیا لیکن خود اس واقعے کی نوعیت قابل توجہ ہے۔

امام حسینؑ مادی جنگ لڑ کر فتح پانے کا منصوبہ کبھی سامنے نہ رکھتے تھے۔ 53ھ سے جب سے بیعت کا مطالبہ شروع ہوا، امامؑ نے مادی جنگ کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ اس لئے نہیں کہ منصوبہ بنانا بجائے خود کوئی اچھی چیز نہ تھی۔ بالکل اچھی چیز تھی اور اگر انقلاب کے

لئے معاشرہ تیار ہوتا تو بہر حال دمشق کے جبابرہ کا تختہ الٹ دینا چاہیے تھا۔ حسینؑ انقلابی تھے۔ انقلابی نہ ہوتے تو شہادت کیلئے کیوں تیار ہوتے لیکن صرف انقلابی ہی نہ تھے، سماجی رجحانات کے گہرے نقاد اور تجزیہ کنندہ بھی تھے اور اس لئے اس بات سے باخبر کہ انقلاب کے لئے حالات ساز گار نہیں ہیں چنانچہ انہوں نے 53ھ سے لے کر 9 اور 10 محرم کی شب تک کسی مرحلے پر باقاعدہ جنگ کیلئے یزیدیوں کا مقابلہ کرنے کا منصوبہ نہیں بنایا۔ اعزاء اور ساتھیوں کا یہ جلسہ اس میں امامؑ کی پیشکش اس بات کا صاف اظہار تھا کہ امامؑ دمشق کے جبروت کا مقابلہ کس انداز پر کرنا چاہتے تھے۔ حسینؑ نے شروع سے دمشق کے ساتھ جو مساوات (ایکویشن) قائم کی وہ یہ تھی کہ یزیدیوں سے ایک ایسی جنگ لڑی جائے جس کا نتیجہ لازمی مادی ہار اور یقینی اخلاقی جیت کی شکل میں سامنے آئے۔ یہی اندازِ فکر، یہی سوچ تھی جو واضح طور پر نمایاں شکل میں اس جلسے میں بھی رونما ہوئی۔

تاریخی اعلان

جلسے میں امام حسینؑ نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ 10 محرم کو جنگ لڑی جانے والی ہے۔ اس کا مادی نتیجہ ہار کی شکل میں برآمد ہوگا۔ اگر امامؑ کا مقصد دمشق کے تخت پر قبضہ کرنا ہوتا تو اس مرحلے پر ان کے سامنے بھی وہی راستہ تھا جو انہوں نے اپنے اعزاء اور احباب کے لئے تجویز کیا تھا۔ اس لئے کہ اگر رات کی تاریکی میں اعزاء اور احباب، جان بچا سکتے تھے، کم سے کم جان بچانے کی کوشش کر سکتے تھے نیز تخت پر قبضے کی خواہش اگر بہتر مادی زندگی گزارنے کے مقصد سے تھی تو ہار کا پورا یقین ہونے کے بعد بیعت سے انکار کا موقف ختم ہو جانا چاہیے تھا اور امام کو بھی رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر جان بچانے کی کوشش کرنا چاہیے تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اگر بیعت سے انکار تختِ دمشق پر قبضے کی توقع

سے وابستہ تھا تو اس توقع کے بالکل ختم ہو جانے کے بعد یہ انکار ختم ہو جانا چاہیے تھا یا پھر دوسری صورت یہ تھی کہ جان بچانے کے اس آخری موقع سے فائدہ اٹھا کر کہیں پناہ لے لی جاتی تا کہ تخت پر قبضہ کی توقع مستقبل کے کسی بہتر امکان پر پوری کی جاسکتی۔ لیکن امام حسینؑ نے یہ دونوں راستے اختیار نہ کیے — کیوں؟ بات کو اس مفروضے سے شروع کیجئے کہ امام حسینؑ تختِ دمشق پر قبضے کا منصوبہ اپنے سامنے رکھتے تھے اور بیعت سے انکار کی وجہ یہ تھی کہ امامؑ بیعت کر کے اپنے منصوبے سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ یوں کہیے کہ اگر امامؑ کے ذہن میں یہی منصوبہ ہوتا تو وہ شروع سے وہی قدم اٹھاتے جو اس منصوبے کے حصول میں مدد و معاون ثابت ہوتے۔ واضح طور پر اس نوع کا منصوبہ امام حسنؑ کی شہادت کے بعد ہی امام حسینؑ کے ذہن میں آسکتا تھا لیکن امام حسنؑ کی شہادت 28 صفر 50ھ کو ہوئی گویا آئندہ گیارہ سال کے دوران جو واقعہ کربلا کے رونما ہونے تک کا وقفہ ہے اس میں امام حسینؑ کو اس قسم کے اقدامات کرنے تھے جو تختِ دمشق کا تختہ الٹنے اور ایک طاقتور عوامی بغاوت پیدا کرنے کے لئے ضروری تھے لیکن تاریخ نے کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا جو امامؑ کو اس قسم کی کسی سعی کی نشاندہی کرتا ہو بلکہ اس کے برعکس ہم ہر مرحلے پر امامؑ کے ایسے اعلانات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ وہ حسنؑ معاویہ معاہدے پر پوری طرح عمل کرنا چاہتے ہیں۔ یزید کی طرف سے مطالبۂ بیعت کے بعد بھی امامؑ نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو تخت دمشق پر قبضے کے منصوبے کا پتہ دیتا ہو، لیکن چلئے گزشتہ سارے اقدامات چھوڑ دیجئے تو 9 اور 10 محرم کی شب کے اس یادگار اجتماع میں امامؑ کا یہ اعلان کہ میرے اعزاء اور اقارب رات کی تاریکی میں کہیں چلے جائیں۔ وہ تو لازماً اس بات کا صاف اعلان تھا کہ جنگ اور حملے کے ذریعے کسی ممکن فتح کا حصول پیش نظر نہیں تھا بلکہ مقصود کچھ اور تھا۔ سوال یہاں یہ ہے کہ امامؑ نے

رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خود اپنی جان بچانے کی کوشش کیوں نہ کی؟ جان بچانے کے صاف معنی یہ ہوتے کہ امام تختِ دمشق پر قبضے کے منصوبے کو وقتی طور پر ناکام دیکھ کر کسی سازگار مستقبل کے امکان کے لئے کربلا کے خطرات سے بچ کر نکل گئے۔ یہ سوچنا صحیح نہ ہوگا کہ بچ نکلنے کی کوئی صورت موجود نہیں تھی۔ اس لئے کہ امکان موجود نہ ہوتا تو امام اپنے اعزاء اور ساتھیوں کو بچ نکلنے کا مشورہ کیوں دیتے اور جواب میں ان کے ساتھیوں کی طرف سے یہ نہ کہا جاتا کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں ہیں۔ گویا چلے جانے کا امکان سب کے خیال میں موجود تھا۔ ورنہ اس مشورے کا جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ اس وقت تو بچ کر نکل جانے کا امکان ہی موجود نہیں ہے۔ جہاں تک امامؑ کا تعلق ہے انہوں نے پہلے بھی اور اس رات کو بھی صاف کہا کہ — وہ میرے خون کے پیاسے ہیں — اور — میں ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتا ہوں۔ ذرا غور اور توجہ سے پڑھیئے کہ — وہ میرے خون کے پیاسے ہیں! یعنی مسئلہ یہ نہ تھا کہ — حسینؑ کسی کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے تھے بلکہ سوال خون کے پیاسے ہونے کا تھا۔ خون کا پیاسا — مگر کیوں؟ مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ تاریخ کے اراذل، تاریخ کے اکابر کے ہمیشہ سے خون کے دشمن رہے ہیں، لیکن خیر یہ تو سخن گستری کی بات ہوئی۔ اب ذرا سوچ کو آگے بڑھایئے اور سوال یہ پوچھئے کہ اگر حسینؑ بیعت بھی کر لیتے تو پھر کیا صورت بن کر سامنے آتی۔ دو ہی صورتیں ممکن تھیں، یا تو دمشق کے حکمران بیعت کے بعد اس اہانت کے پیش نظر جو آنحضرتؐ اور ان کے خاندانؑ کی اس بیعت کی بنا پر ہوتی، اپنے جذبۂ نفرت کو تسکین دے لیتے اور یا یہ کہ بیعت کر لینے کے باوجود — خون کا پیاسا — ہونے کی وجہ سے امامؑ کی شہادت کا مجرمانہ کارنامہ سرانجام دے ڈالتے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ وہ آخر الذکر قدم اٹھاتے۔ اس لئے کہ اگر مقصود صرف امام

حسینؑ سے بیعت لینا تھا تو شہادت امامؑ کے بعد سارا قصہ ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن قصہ تو ختم نہیں ہوا بلکہ داستان کا انتہائی المناک تسلسل واقعۂ شہادت کے بعد بھی جاری رہا۔ گویا سوال صرف بیعت کا نہ تھا بلکہ اس عداوت کا تھا جو دمشق کے حکمرانوں کے سینوں میں مچل رہی تھی۔

اور — بیعت......؟

امام حسینؑ نے بیعت کیوں نہیں کی......؟ ساری داستان کا مرکزی نقطہ یہی ہے — تخت دمشق پر قبضہ مقصود نہ تھا۔ مقصود ہوتا تو 10 محرم کی شب تک مکمل ہار یعنی تخت پر قبضے کے امکان کی آخری رمق ختم ہو جانے پر بیعت کر لینی چاہیے تھے۔

واضح اس سے کیا ہوا، یہی تو ہوا نا کہ اصل مسئلہ یعنی انکار بیعت کا معاملہ کسی اور سطح سے تعلق رکھتا ہے۔ حسینؑ کسی کا تخت چھیننے کے لئے کربلا نہیں آئے تھے — مگر ہاں — اس نقطے پر ذرا رک جایئے۔ حسینؑ بیعت سے منکر تھے لیکن بیعت سے انکار کے لئے یہ کہاں لازم آیا کہ وہ اپنی جان بچانے کیلئے رات کی اندھیاریوں میں کہیں اور جانے کی کوشش نہ کریں۔ کوشش کر سکتے تھے لیکن نہ کی — کیوں — ؟ کیا اس لئے نہیں کہ اس طرح چلا جانا موت سے ڈر کر بھاگنے کے مترادف ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں کیا یہ بزدلی نہ ہوتی جبکہ حسینؑ کے یہاں سارا زور شرافت کی بنیادی اقدار پر ہے لہٰذا بیعت سے انکار بھی اسی سطح کی سوچ سے کیا جا رہا تھا۔ اس بارے میں امامؑ نے اپنا نقطۂ نظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے اور اس کے ساتھ ایک یہ اصول بھی کہ ظلم کے ساتھ زندہ رہنا فرد کی اپنی ذات کی توہین ہے۔''

یاد رہے اس قصے میں بھی حسینؑ کی وہی پالیسی سامنے آئی جو ان کے تمام

اقدامات کے پس منظر میں موجود رہی ہے یعنی اچھے مقاصد کے لئے اچھے ذرائع کا استعمال۔ اپنی جان کی حفاظت ایک اچھا مقصد ہے لیکن اس مقصد کا حصول بُرے ذرائع سے جائز نہیں۔ زندگی کا تحفظ بہادری کے ساتھ، بزدلی کے ساتھ نہیں۔

مگر— مگر اس سوال پر تو سوچئے کہ امام حسینؑ نے آخر بیعت سے انکار کیوں کیا؟ بیعت سے انکار کا مطلب بھی امام جانتے تھے اور اس کا نتیجہ بھی ان کے سامنے واضح تھا۔ کم سے کم 10 محرم کی رات تک تو یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ بیعت سے انکار کے واضح معنی موت کے ہیں۔ حسینؑ موت کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہو گئے مگر بیعت پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ سوال یہ ہے، بیعت اتنی اہم کیوں تھی کہ اسے موت پر بھی ترجیح دے دی گئی۔ جواب اس سوال کا یہ دیا گیا کہ یزید فاسق و فاجر— تھا اس لئے امامؑ نے بیعت سے انکار کر دیا تو کیا مطلب اس کا یہ نکالا جائے کہ اگر یزید فاسق و فاجر نہ ہوتا تو امام بیعت کر لیتے۔ اس لئے یہ کہنا کہ اگر یزید فاسق و فاجر نہ ہوتا تو امام بیعت سے انکار نہ کرتے، حسینؑ سے صحیح نقطہ نظر کی نمائندگی نہ ہوگی لیکن ذرا ٹھہریے۔ اس مسئلے پر اتنی سی بات کہہ کر آپ آگے نہیں بڑھ سکتے اس لئے کہ یزید کی بیعت سے انکار کے معاملے میں بار بار اس کے فاسق و فاجر ہونے کی خصوصیت کو بطورِ عذر پیش کیا گیا ہے۔

فاسق و فاجر—! سوال یہ ہے، فاسق و فاجر— سے مراد ہے کیا؟ واضح طور پر ایک مذہبی اصطلاح ہے اور اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یزید ان اخلاقی اقدار کو کھل کر توڑ دیتا تھا جنہیں مسلم معاشرہ تقدس کی نظر سے دیکھتا ہے تو اب امام حسینؑ کا کیا موقف نکل کر سامنے آتا ہے۔ امام حسینؑ نے اس بات کا کوئی عندیہ نہیں دیا کہ یزید فاسق و فاجر نہ ہوتا تو وہ بیعت کر لیتے لیکن اس کے فسق و فجور اور ظلم و عدوان کی طرف بار بار اشارے کئے ہیں تو

بات مآل کار کیا ہوئی بات جو کچھ ہوئی وہ یہ ہے کہ امام فسق و فجور کا ذکر بیعت سے انکار کے جواز میں نہیں کر رہے تھے بلکہ یزید کی اس جسارت کے سلسلے میں کر رہے تھے کہ وہ بیعت کا مطالبہ کر رہا ہے۔ بالالفاظ دیگر امامؑ کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یزید جیسے شخص کو بیعت کا مطالبہ کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا، اس لئے کہ وہ فاسق و فاجر ہے نہ یہ کہ یزید چونکہ فاجر ہے اس لئے وہ اس کی بیعت نہ کریں گے۔ ورنہ اگر بات یہی ہوتی کہ امامؑ یزید کے فسق و فجور کی بناء پر اس کی بیعت سے منکر تھے تو پھر کسی نے روکا تھا کہ وہ کھل کر یہ کمٹمنٹ نہ دیں۔ امامؑ یقیناً یہ کمٹمنٹ دے سکتے تھے لیکن انہوں نے یہ کمٹمنٹ نہ دیا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ امامؑ کے خیال میں ان کی اپنی موجودگی میں کسی شخص کو بیعت کرانے کا حق نہیں پہنچتا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ بات یہ تھی تو کیوں امامؑ نے اس بات کو کھل کر نہ کہہ دیا، مثلاً امامؑ کہہ سکتے تھے کہ یزید کو میری بیعت کرنی چاہیے، میں اس کی بیعت کیوں کروں؟ یقیناً حسینؑ ابن علیؑ کا موقف یہی تھا لیکن یزید کے مطالبۂ بیعت کے جواب میں اس موقف کا اعادہ ادعائے خلافت کے ہم معنی ہونا اور ادعائے خلافت واضح طور پر اعلانِ بغاوت تھا لیکن یہ اعلان بغاوت ہر سوشیالوجیائی جائزے کے تحت ناکام ہو جانے والا تھا اور ناکام ہو جانے کے ساتھ دمشق کے حکمرانوں کو یہ عذر بھی مہیا کر دیتا کہ حسینؑ بغاوت کے مرتکب ہوئے ہیں اور بغاوت کا فرو کرنا حکومت کا فرض ہے لہٰذا واقعۂ کربلا حکومت کے امن و قانون برقرار رکھنے کی ذمہ داریوں کی بجا آوری قرار پا جاتا تو یوں امام حسینؑ نے اس بڑی نازک اور الجھی ہوئی صورتِ حال سے بچنے کے لئے ایک ایسا موقف اختیار کیا جو اس مشکل ترین صورتِ حال میں واحد معقول اور ہوشمندانہ موقف رہ گیا تھا۔ حسینؑ اپنے آپ کو روحانی اور مادی قیادت کا مستحق جانتے تھے اور ان کا یہ موقف بالکل صحیح بھی تھا اس لئے کہ وہ مسلم معاشرے کی سب

سے بہتر شخصیت تھے لیکن ساتھ ہی حسینؑ یہ بھی جانتے تھے کہ اس طرح کے دعوے کا پیش کرنا اس واضح تجربے کے پیش نظر جوان کے بھائی امام حسنؑ کو ہو چکا تھا۔ محض ایک بے نتیجہ بات ہے اور نہ صرف بے نتیجہ بلکہ مضر بھی۔ اس لئے کہ اس طرح کا ادعا دمشق کو ایک عذر بھی مہیا کرنے کا سبب بنتا جبکہ امام دمشق کو یہ عذر مہیا کرنے کو تیار نہ تھے۔

باایں وجوہ امام حسینؑ صرف یہی کہتے رہے کہ یزید فاسق و فاجر ہے۔ اسے بیعت کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ حق کسے کہتے ہیں۔ اسے انہوں نے بالکل واضح مشکلات کی بناء پر تصریحی طور پر بیان نہ کیا کہ اس کی وضاحت حالات کی عملی منطق کے پیش نظر غیر انسب تھی۔ تو یہ تو مسئلہ رہا فسق و فجور کا لیکن بات صرف فسق و فجور پر تو آ کر نہیں رک جاتی۔ مسئلہ تو ظلم و عدوان کا بھی ہے اور امام نے بار بار دمشق کے ظالم ہونے کا ذکر بھی کیا ہے بلکہ اس مرحلے پر حسینؑ نے تاریخِ تہذیب میں ایک انتہائی شرافت آمیز تصور متعارف کرایا ہے۔ حسینؑ ابن علیؑ نے انسانوں کو یہ بتایا کہ — "ظلم کے ساتھ زندہ رہنا فرد کی ذاتی توہین کی حیثیت رکھتا ہے۔" یہاں ایک انتہائی شریفانہ سن سبلٹی (حسیت) کا پہلو قابل توجہ ہے یعنی سوال صرف ظلم سہنے کا نہیں ہے کسی پر ظلم کو برداشت کرنے کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ مرحلہ اخلاقی قدروں کی حسیت کا اس نقطے پر پہنچا ہے کہ معاشرے میں ظلم کی موجودگی ایک شریف انسان کی ذاتی توہین کی حیثیت حاصل کر گئی ہے۔ اخلاقی اقدار کے بارے میں شدید الاحساسی کی یہ منزل صرف حسینؑ ابن علیؑ کے یہاں ملتی ہے کسی دوسرے کے یہاں موجود نہیں۔

تو یہ رہا مسئلے کا اخلاقی پہلو، لیکن بات کو سیاسی منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس مرحلے پر سوال یہ اٹھایئے کہ اگر حکمران فاسق و فاجر اور ظالم ہو تو کیا اس کے خلاف فرد کو

بغاوت کا حق حاصل ہے؟ اس کا فوری جذباتی جواب اثبات میں ہوگا لیکن امام حسینؑ کا یہ جواب نہیں ہوگا اور آپ مسئلہ کا غیر جذباتی انداز میں جائزہ لیں تو امامؑ کے اس موقف کی تائید کریں گے۔

حکومت اور بغاوت

سب سے پہلے تو سوشیالوجیائی حقیقت یہ ہے کہ حکومت کا خود ادارہ ہی اپنی ذات میں جبر پر مشتمل ہوتا ہے۔ ظلم پر تو ہر حال میں نہیں مگر جبر پر ضرور۔ حکومت سے متعلق مثالیوں کی بات کو تو چھوڑیئے ہاں تاریخ میں حکومت جس انداز سے آئی ہے اس سے یہ بات بار بار سامنے آتی رہی کہ حکومتی ادارہ جبر کی اساس پر ہی کھڑا ہوتا ہے۔ جبر اور ظلم میں بال برابر فرق ہے۔ ہر جبر ظلم نہیں ہوتا اور ہر ظلم کا جبر ہونا ضروری نہیں تاہم دونوں اتنے ساتھ ساتھ چلتے ہیں کہ کم ہی ان کی سمتیں الگ ہو پاتی ہیں۔

ایک دوسری المناک حقیقت تاریخ میں یہ ابھر کر آئی ہے کہ حکمران عام طور پر فاسق و فاجر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر بات صرف فسق و فجور کی ہو یعنی اصول یہ طے کر لیا جائے کہ ہر فاسق و فاجر حکمران کے خلاف بغاوت ہر شہری کا فرض قرار دے دیا جائے تو کوئی منظّم حکومت زائد عرصے قائم نہیں رہ سکتی اور کوئی شہری سکون کی زندگی نہیں گزار سکتا۔

یہاں یہ سوال نہ اٹھایئے کہ فسق و فجور کی اپنی اصطلاح اضافی حیثیت رکھتی ہے وہ چیز جسے مسلم معاشرہ فسق و فجور گردانتا ہے۔ دوسرے معاشرے اسے آرٹ کی خدمت قرار دے سکتے ہیں۔ یہاں تو آپ فسق و فجور کی تعریف صرف اس قدر قرار دے لیں کہ وہ تمام اقدامات جو کسی معاشرے میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے جائیں اور جنہیں متعلقہ معاشرے کی مقدس قدروں سے متصادم سمجھا جائے۔ فسق و فجور کے ذیل میں شمار ہوں گے۔

مسلم معاشرہ کوئی عام معاشرہ نہیں تھا۔ اس معاشرے کے سامنے ایک آئیڈیل، ایک مثال یہ تھا۔ ایک ایسے معاشرے میں جو مثالیہ بداماں ہو یہ بات مضحکہ خیز ہوگی کہ ایک ایسا شخص معاشرے کا نگراں ہو جو اس مثالیے کا مذاق اڑاتا ہو اور وہ شخص جو اس مثال کا نمائندہ ہو، بغاوت ہی نہیں صرف حقِ اختلاف تک سے محروم کر دیا جائے۔ افلاطون تو اپنے مثالیئے میں شعراء تک کو داخلے کی اجازت دینے پر راضی نہ تھا اس لئے کہ وہ ہومر کی طرح دیوتاؤں کی مذموم حرکات کا بیان کر کے عوام کے خیالات بگاڑ دیں گے چہ جائیکہ ان لوگوں کا حکومت میں آجانا جو اس مثالیے کی جڑیں کاٹنے کا اعلان کر دیں جس پر معاشرے کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

ارسطو نے تو یہاں تک احتیاط برتی ہے کہ اس نے حکمرانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ خراب قوانین کے بدلنے سے پہلے بار بار سوچ لیا کریں اس لئے کہ قوانین عادتوں کے ارتساخ پر قائم ہوتے ہیں اور عادت پذیری کا عمل طویل مدت لیتا ہے۔ یہ احتیاط بُرے قوانین کے سلسلے میں بھی برتنی ضروری ہے چہ جائیکہ اچھے قوانین اور چہ جائیکہ وہ قوانین جو مثالی معاشرے میں نافذ ہوں اور جن پر خود مثالیے کی نیو رکھی ہو۔ اس کو توڑنا تو سنگین بغاوت ہے، لیکن یہ وہ بغاوت تھی جو دمشق نے کی تھی۔ جس کی مزاحمت کرنا مسلم معاشرے کی تمام شریف روحوں کا فرض تھا۔ قدرتی طور پر حسینؑ اس مزاحمت کے رہنما تھے۔ لیکن امام حسینؑ مسائل کو جذباتی سطح پر طے کرنے کے حامی نہ تھے۔ مزاحمت کے لئے سازگار ماحول موجود نہ تھا۔ اس لئے حسینؑ اور ان کے بھائی حسنؑ نے دمشق کی حکمرانی کو ڈی فیکٹو طور پر تسلیم کر لیا لیکن ڈی جوری انداز میں ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لئے ڈی جوری انداز میں ماننے کا مطلب یہ ہوتا کہ حسینؑ ان تمام اقدامات کی توثیق کر دیتے جو دمشق کے حکمران کر رہے تھے۔

بیعت! وہ اہم لفظ ہے جو 1400 سال سے مسلم تاریخ کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ اپنے ماخذ کے اعتبار سے یہ لفظ ''بیع'' سے نکلا ہے۔ دنیوی معاشروں میں یہ لفظ کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ اس کے معنی صرف روحانی معاشرے کے ماحول میں پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو دوسروں کے ہاتھ ''بیع'' کر دینا روحانی اطلاق رکھتا ہے۔ مادی یا دنیوی نہیں۔ دنیوی معاشرے کا حکمران صرف حکمران ہوتا ہے، روحانی پیشوا نہیں ہوتا۔ بیعت روحانی پیشوا کی کی جاتی ہے۔ دنیوی حکمران کی نہیں اس لئے کہ فرد اپنی ذات کو روحانی لیڈر کے ہاتھ بیع کرتا ہے۔ عام دنیوی حکمران کے ہاتھ پر نہیں۔ یوں بیعت یا بیع کا مطالبہ ایک آئیڈیل حکمران کر سکتا ہے عام حکمران نہیں۔ اس آئیڈیل حکمران کے ہاتھ پر جو بیعت ہوگی وہ فی الواقع اس آئیڈیل سے بیعت ہوگی جس کی یہ حکمران نمائندگی کرتا ہے۔ خود اس حکمران یا لیڈر کی اپنی ذات سے بیعت نہ ہوگی۔

یزید مسلم معاشرے کا حکمران تھا لیکن وہ ان تمام مثالیوں کا مذاق اڑاتا تھا جو مسلم معاشرے میں مقدس خیال کئے جاتے ہیں۔ یزید فاسق و فاجر تھا، مطلب یہ کہ وہ مسلم معاشرے کی بنیادی قدروں کو علی الاعلان توڑتا تھا۔ ایسے میں اس کی یہ توقع کہ لوگ اس کی بیعت کر لیں گے محض مضحکہ خیز تھی — پھر — بازی بازی باریشِ بابا ہم بازی، مطالبہ بھی امام حسینؑ سے جو مسلم معاشرے کی اساسی اقدار کے نمائندے تھے۔

تاریخ نے ہمیں جس یزید سے متعارف کرایا ہے وہ واضح طور پر ایک بدترین حکمران تھا اور ہر شریف شخص کا فرض تھا کہ وہ اس جیسے ظالم حکمران کے خلاف بغاوت کرے اور مسلم معاشرے کے ذمہ دار لوگوں نے بغاوت کی بھی لیکن یزید کے باپ نے اپنے بیٹے کیلئے ایسی مضبوط حکومت چھوڑی تھی جس کے خلاف عملی بغاوت نتیجہ خیز نہ تھی۔ اس لئے ان

چاروں بزرگوں نے جن کی مخالفت کا ذکر باپ نے اپنی وصیت میں کیا تھا براہ راست مقابلے سے اجتناب برتا۔ یہ کہنا البتہ مشکل ہے کہ اگر یزید امام حسینؑ کے علاوہ بقیہ تین حضرات سے بھی بیعت کا مطالبہ کرتا یا اس مطالبے پر اصرار کرتا تو اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ امام حسینؑ کے علاوہ، وہ تینوں حضرات جو یزید کی بیعت سے منکر تھے آخر وقت تک اس انکار پر قائم رہے پھر یہ بھی تاریخ جانتی ہے عبداللہ ابن عمرؓ اور عبدالرحمن ابن ابوبکرؓ جنہوں نے یزید کی بیعت سے انکار کیا تھا کبھی مدعیٔ خلافت کے طور پر سامنے نہیں آئے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یزید کی بیعت سے انکار کے لازمی معنی یہ نہ تھے کہ بیعت سے انکار کرنے والا بغاوت کا علم لیکر بھی کھڑا ہو گیا ہے۔ خود یزید اس بات کو جانتا تھا کہ بیعت سے انکار لازماً بغاوت کے ہم معنی نہیں ورنہ وہ باقی تین منکرانِ بیعت کے خلاف بھی فوج کشی کرتا یعنی اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ یزید نے امام حسینؑ کے خلاف جو فوج کشی کی اس کا سبب اس کا یہ خوف نہ تھا کہ کہیں امامؑ حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے میدان میں نہ اتریں۔

بیعت سے انکار دراصل اس بات کا اظہار تھا کہ دمشق کی حکومت اس آئیڈیل کی مخالف ہے جو مسلم معاشرے کو عزیز ہیں۔ اس انکار کا لازماً یہ مطلب نہ تھا کہ یزید کی ڈی فیکٹو حکومت کو کمزور سمجھ کر بغاوت کا اعلان کیا جا رہا ہے لیکن یہ مطلب ضرور تھا کہ یزیدی حکومت کی ڈی جوری حیثیت سے انکار کیا جا رہا ہے گویا انکار یہ کیا جا رہا ہے کہ دمشق کے حکمران اس آئیڈیل سے منکر ہیں جس پر مسلم معاشرے کو چلنا ہے۔

مذہب اور معاشرہ

آئیڈیل — ! مسلم معاشرہ ایک مذہبی معاشرہ ہے اور ہر مذہبی معاشرہ آئیڈیل نواز معاشرہ ہوتا ہے۔ مثالیہ نواز کا مطلب یہ کہ ہر معاشرے کے لئے کچھ قدریں محترم ہوتی

ہیں۔ طرزِ عمل (Behaviour) یا کردار کے کچھ پیمانے ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرہ قابلِ احترام خیال کرتا ہے اور جن پر وہ اپنے لیڈروں کو ناپتا ہے۔

مسلم معاشرہ دوسرے معاشروں کی طرح عدل وانصاف اور ظلم دشمنی کو بنیادی اقدار قرار دیتا ہے۔ انسانوں نے اب تک کوئی ایسا معاشرہ قائم نہیں کیا جس نے عدل کو بحیثیت عدل کے محترم قرار نہ دیا ہو اور ظلم کو بحیثیت ظلم کے قابل مذمت نہ سمجھا ہو۔ یہ بات اور ہے کہ انہوں نے عدل کے مفہوم اور ظلم کے معنی میں اختلاف کیا ہو۔ مسلم معاشرے کے حامی جب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا معاشرہ عدل پر مبنی ہے اور دوسرے معاشرے عدل سے ہٹے ہوئے ہیں تو ان کا موقف فی الواقع یہ نہیں ہوتا کہ دوسرے معاشرے عدل کے دشمن ہیں۔ موقف یہ ہوتا ہے کہ گو دوسرے معاشرے بھی عدل کی حمایت کرتے ہیں لیکن عدل کے اصول کا ان کا اطلاق عملاً ظلم بن جاتا ہے جبکہ مسلم معاشرہ ایسے اصولوں پر مبنی ہے جن کی وجہ سے عدل کا زیادہ سے زیادہ اطلاق ممکن ہوتا ہے یقیناً دوسرے معاشروں کے حامی بھی تو یہی موقف رکھتے ہیں کہ ان کے اصول عدل سے قریب تر ہیں تو اب ان مختلف ادعاؤں میں صحت سے کون قریب تر ہے اور کون بعید۔ لیکن یہ بحث ہم چھیڑیں تو اپنے موضوع سے کافی دور چلے جائیں گے اس لئے انسب یہی ہے کہ پھر اس سوال کو اٹھائیں جو مسلم معاشرے کی مثالیہ نوازانہ حیثیت کے بارے میں ہماری بحث کا موضوع بنا تھا۔

حکومت کا ادارہ معاشرے کے ایک اہم ادارے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ کہنا کہ سب کچھ حکومت ہی ہوتی ہے صحیح نہیں ہے۔ مثالیے پورے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں صرف حکومت سے نہیں تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ مثالیے ہوتے ہیں اور یہ مذاہب براہِ راست معاشروں سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر یوں کہیے کہ مذاہب یا

مثالیے براہِ راست فرد سے تعلق رکھتے ہیں۔ معاشرے سے تعلق فرد کے بعد آتا ہے جو فرد کے توسط سے پیدا ہوتا ہے۔ خیر اور اس کی خصوصیت کے بارے میں ہر فرد کچھ تصورات رکھتا ہے یہی تصورات اس کے آئیڈیل یا مثالیے ہوتے ہیں۔ ان مثالیوں سے معاشرے کے مختلف افراد مختلف مساواتیں رکھتے ہیں یعنی یوں کہیے کہ ان مثالیوں سے ہر فرد کا ارتباط جداگانہ سطح پر ہوتا ہے۔ فرد پہاڑ کی کوہ میں رہتا ہو یا خانہ بدوش قبیلے کی کسی عارضی قیام گاہ میں، بہر حال کسی نہ کسی مذہب کا پیرو ضرور ہوتا ہے۔

مذہب اپنے وسیع تر مفہوم میں اس نقطۂ نظر کا نام ہے جو فرد اپنے ماحول اور کائنات سے اپنے رشتے کے بارے میں خود اپنے ماحولی ورثے سے حاصل کرتا ہے اور اس اعتبار سے آج تک کسی ایسے انسان نے اس کرۂ ارض پر سانس نہیں لیا جو کوئی مذہب نہ رکھتا ہو۔ مذہب کا بنیادی مقصد فرد ہوتا ہے اور پھر فرد کے توسط سے معاشرہ، فرد کے زندہ رہنے کے لئے معاشرے کا وجود ضروری نہیں ہے اور معاشرے کے لئے حکومت کا ہونا ضروری نہیں۔ حکومت کا ادارہ صرف چند ہزار سال پرانا ہے۔ اپنے موجودہ مفہوم میں یہ ادارہ زراعت کی دریافت کے بعد ظہور میں آیا ہے۔ جبکہ موجودہ ہیت کے انسان کی عمر تو 35 لاکھ سال بتائی گئی ہے۔ کم سے کم دس لاکھ سال تو یقیناً۔ معاشرہ چند خاندانوں کے ساتھ رہنے سے وجود میں آ جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ انسان کی عمر کا محض نا قابلِ ذکر حصہ حکومت کے ادارے کے ساتھ گزرا ہے جبکہ انسان کی اپنی ساخت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ کسی کائناتی تصور کے بغیر یعنی کسی نہ کسی قسم کے مذہب کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حکومت مذہب یا معاشرے کے لئے ضروری ادارے کی حیثیت رکھتی ہے، صحیح سوچ نہیں ہے۔

اس مرحلے پر ہمیں دو مفاہیم کو ذرا جدا جدا رکھ کر دیکھ لینا چاہیے دنیا کے تمام

مذاہب اپنے آغاز میں مثالی معاشرے قائم کرتے ہیں چاہے ان میں سے بعض ابتداء میں مثالی حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے ہوں لیکن آغاز سے کچھ عرصے بعد مثالی معاشرے کی جگہ مثالیوں والا معاشرہ وجود میں آجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ مثالی معاشرہ تو ختم ہوجاتا ہے مگر وہ مثالیے معاشرے کے لئے کردار کے پیمانے برابر بنے رہتے ہیں جن پر اس مذہب کے اصول مبنی ہوتے ہیں۔ مثالی معاشروں کے تصور پانچ سو پچاس گنے گئے ہیں جن میں خال خال عملی زندگی میں آزمائے جاسکے۔

اس جائزے کی روشنی میں آپ مسلم تاریخ کو بھی دو حصوں میں بانٹ لیجئے، ایک وہ دور جسے مثالی معاشرے کا دور کہا جاسکتا ہے اور دوسرا وہ جب مسلم معاشرے مثالی معاشرہ ہونے کی بجائے مثالیوں سے متاثر ہونے والے معاشرے رہ گئے۔ اب تک مسلم معاشرے اسی دوسرے دور سے گزر رہے ہیں۔

پانچ سو پچاس تصورات میں سے جو مثالی معاشروں کے سلسلے میں پیش کئے گئے ہیں جو مذہبی مثالیے تھے ان کے پس منظر میں مابعد الطبیعاتی تصورات بھی تھے جبکہ غیر مذہبی مثالیے اس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ غیر مذہبی معاشرے کبھی عملی زندگی نہیں دیکھ سکے۔ اشتراکی معاشرے کمیونسٹ سوسائٹی کے قیام کے آئیڈیل کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں مگر اپنی منزل کو نہ پاسکے اور فروری 1981ء کہ 26 ویں کمیونسٹ پارٹی کانگریس منعقدہ ماسکو میں جو تفصیلات بیان کی گئیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت معیشت زوال کی زد میں ہے اس لئے کمیونسٹ معاشرے کا قیام مستقبل قریب میں ممکن نظر نہیں آتا۔

مذہبی معاشرے مابعد الطبیعاتی اساسیں رکھنے کی بناء پر متعلقہ معاشروں کی عظیم

اکثریت کے لئے چند آئیڈیل ہمیشہ باقی رکھتے ہیں اور اس لئے زیادہ طویل عرصے زندہ رہنے کی اہلیت کے حامل ہوتے ہیں۔

اقتدار کی خواہش

مسائل کے اس پس منظر میں اگر آپ حالات کا جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حکومت کے بگاڑ کے باوجود معاشرہ اپنی وسیع تر سرگرمیوں میں مثالیے کے احترام کے جلو میں چلتا رہتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ حکمران بگڑ جائے تو لازمی طور پر سارا معاشرہ بھی بگڑ جائے، البتہ یہ صحیح ہے کہ حکومت کے بگاڑ سے معاشرے کے بگاڑ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ بڑی حد تک انحصار اس بات پر ہے کہ خود حکومت کن افراد پر مشتمل ہے۔ جری اقدار شکنوں پر یا معتدل مزاج قسم کے بگڑے حکمرانوں پر۔ مطلب یہ کہ جری اقدار شکن حکمرانوں کے عہد میں بھی ایک امن پسند شہری زندگی گزار سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ جری قدر شکن حکمران معاشرے کی اقدار اور مثالیوں کو توڑ کر ان کی جگہ نئی قدریں نہ لے آئیں اور بشرطیکہ وہ ان نئے مثالیوں اور نئی قدروں کی توثیق عوام سے نہ چاہیں اور اس توثیق کو موت اور پھانسی کی سزا کی ترازو میں نہ تولیں۔

یزید نے یہی صورت پیدا کر دی تھی اور اس لئے امام حسینؑ نے وہ فیصلہ کن قدم اٹھایا جس نے تمام مسلم تاریخ کو سنہرا روپ دے دیا۔ اقتدار کی خواہش ان کی خواہشوں میں شامل ہے جو کبھی تسکین نہیں پاتیں۔ انسان کی تین بنیادی خواہشوں دولت، شہرت اور اقتدار میں سے ہر ایک جتنی مطمئن ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ غیر مطمئن رہتی ہے اور یوں ایک طویل سلسلہ ہے خواہش کے اضافے کا جو کسی نقطے پر اختتام پذیر نہیں ہوتا۔

ھیروڈوٹس یونانی مورّخ نے اقوام وملل کی حکومتوں کا جائزہ لے کر یہ رائے قائم کی تھی کہ ار

صاحبِ اقتدار کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے اور مکمل اقتدار مکمل طور پر تباہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

ھیروڈوٹس نے جس خطرے کی طرف اشارہ کیا تھا اس سے بچنے کے لئے فلسفۂ سیاسیات نے سارے پاپڑ بیلے ہیں لیکن گو جمہوری اداروں کے ذریعے اس خطرے کا سدباب کرنے کی موثر کوشش کی گئی ہے تاہم اس ہفت خواں کو ابھی تک سر نہیں کیا جاسکا اور خیر کے اعتبار سے اس نامکمل دنیا میں یہ ممکن ہی نہیں کہ اقتدار کے کسی ایک نقطے پر ارتکاز کے سنگین خطرات پر مکمل قابو پالیا جائے۔

سوال یہ ہے کیا امام حسینؑ یزید سے اقتدار کی جنگ لڑ رہے تھے؟ واضح طور پر ہم اس کتاب میں ٹھیک اسی سوال پر سوچتے رہے ہیں اور 53ھ سے لے کر یعنی اس وقت سے لے کر جب یزید کے باپ نے امامؑ سے بیعت کا مطالبہ شروع کیا اور 10 محرم کی سہ پہر تک جب امام حسینؑ یزیدی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ہر مرحلے پر نتیجہ یہ ہی نکل کر سامنے آیا کہ یزید کی طرف سے اور اس کے باپ کی طرف سے بھی جنگ صرف اقتدار کے نقطے کے گرد گھومتی رہی لیکن امام حسینؑ مسائل پر تہذیبی اقدار اور اصولوں کی روشنی میں سوچتے رہے۔ اقتدار کی جنگ کے لئے فوجی طاقت مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتی ہے لیکن آٹھ سال کے طویل عرصے میں امامؑ نے کبھی فوجی طاقت جمع کرنے یا دمشق کے خلاف گوریلا دستے، رضا کار یا انقلابیوں کو منظم کرنے کی سعی نہیں کی بلکہ حضرت مسلمؑ نے تو ایک اخلاقی تصور کے مانع بن جانے کی وجہ سے نہتے اور تنہا ابن زیاد کو بہ آسانی قتل کر دینے کے عملی طور پر سنہری موقعے کو پوری شعوری حالت میں خالی جانے دیا ورنہ ابن زیاد اسی وقت مار ڈالا جاتا تو کربلا کی آدھی جنگ یقیناً جیت لی جاتی اور نہیں کہا جاسکتا کہ بقیہ آدھی کا نتیجہ بھی یزید کے حق میں نکلتا۔ اقتدار کی جنگ زیادہ تر اقدار کی لاشوں پر لڑی جاتی ہے لیکن اور باتوں سے قطع نظر

صرف ایک حضرت مسلمؑ کے اس اقدام سے ہی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حسینؑ اقتدار کی لاش پر قدروں کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے تھے۔

تاریخ میں چند قدم پیچھے ہٹ کر اگر ہم اس خاندان کے طرزِ عمل کا جائزہ لیں، یعنی جائزہ اس بات کا لیں کہ حکومت کے بارے میں امام حسینؑ کے والد اور بھائی، حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کا کیا طرزِ عمل رہا تو ایک حیرت انگیز یکسانیت نظر آئے گی۔ اس ردِ عمل کے بارے میں جو یہ حضراتؑ اقتدار کی فسوں آفرینیوں کے سلسلے میں ظاہر کرتے رہے۔ آنحضرتؐ کی وفات کے وقت جانشینی کا مسئلہ سامنے تھا ایسے مواقع پر تاریخ کا عام تجربہ یہ رہا کہ لوگوں نے جانشین کے تقرر کو فرائض تجہیز و تکفین سے ہمیشہ مقدم جانا۔ خاص طور پر اس وقت جب جانشین کے تقرر کا مسئلہ متنازعہ بھی سمجھا گیا ہو۔ حضرت علیؑ نے امرِ جانشینی کو متنازعہ جاننے کے باوصف تجہیز و تکفین کے فرائض کو اولین اہمیت دی، چاہے اقتدار سے محروم ہی کیوں نہ ہونا پڑا پھر بات اس نقطے پر آ کر نہیں رکتی۔ یہاں تو خیر معاملہ حصولِ حکومت کی کوشش کا تھا مگر ایک مرحلہ وہ بھی آیا تھا جب حکومت خود طشتری میں رکھ کر پیش کی گئی تھی۔ تیسرے خلیفہ کی جانشینی کے موقع پر۔ سو اس وقت بھی حضرت علیؑ کا طرزِ عمل قبولیت سے انکار تھا۔ چوتھی بار خلافت کا تخت پیش کرنے کے لئے مختلف بلاد و احصار کے افراد حضرت علیؑ سے اصرار کرتے ہیں، مگر جواب انکار کی صورت میں دیا گیا۔ حضرت علیؑ چھپنا چاہتے تھے، لوگوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے مگر عوام نے ہجوم کیا اور آخر انتہائی مجبوری کے عالم میں انہوں نے حکمرانی کا فرض انجام دینے کی حامی بھری۔ آپ نے اندازہ لگایا کہ حکومت کی اہمیت اور حکمرانی سے دلچسپی کے باب میں حضرت علیؑ کا اندازِ نظر کیا تھا۔ حکومت ان کے خیال میں ایک انتہائی خطرناک اور مشکل ذمہ داری ہے جس سے بچنے کی ایک

شریف آدمی کو پوری کوشش کرنی چاہیے، نہ یہ کہ خود اس کے حصول کے لئے کوشش کی جائے۔ سازشیں کی جائیں اور قتل و غارت گری کا تو خیر سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے، اور یہ تو چوتھے مرحلے کا معاملہ ہے۔ تیسرے مرحلے پر بھی انہوں نے اپنے گھر میں آئی ہوئی حکومت کو ایک اصولی بات کی بنا پر واپس کر دیا تھا۔ ان سے پہلے دو خلفاءؓ کی سیرت پر چلنے کے بارے میں پوچھا گیا تھا۔ انہوںؑ نے کہا میں ان کی سیرت پر چلنے کا پابند نہیں ہوں۔ وعدہ کر لیتے تو حکومت مل جاتی مگر کوئی وعدہ کرنے سے انہوں نے انکار کر دیا اور یوں گھر آئی ہوئی حکومت پوری طمانیتِ قلب کے ساتھ واپس کر دی۔ یہاں علیؑ ابن ابی طالب کا ایک جملہ سنیئے جو تاریخ کے کسی حکمران کی زبان سے ادا نہیں ہوا — علیؑ نے کہا — دنیا کے تمام محکوم اپنے حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کے شکوہ کناں ہوتے ہیں میں وہ واحد حکمران ہوں جسے اپنے محکوموں کی زیادتیوں کا شکوہ ہے۔ یہ شکوہ کیوں تھا؟ شکوہ اس لئے تھا کہ حضرت علیؑ حکمرانی کو اخلاقی حدود کا پابند رکھتے تھے۔ لیکن حکومت کا ارادہ جبر و استیلا کی منطق سے پیدا ہوتا ہے۔ جسے حضرت علیؑ ناجائز طور پر استعمال کرنے کے لئے تیار نہ تھے لہٰذا محکوم شورہ پشت ہو گئے اور انہوں نے وہ زیادتیاں کیں جو ایک جابر حکومت میں کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے مگر حضرت علیؑ جبر کو آخری دلیل تسلیم کرنے پر تیار نہ ہوئے لہٰذا وہ شکایت زبان پر آئی جو نہ پہلے کسی نے کی تھی نہ ان کے بعد کوئی کر سکا۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ حضرت علیؑ مسلم تاریخ کے وہ واحد حکمران ہیں جو خالص عوامی و جمہوری انداز میں منتخب ہوئے تھے تو بہر حال یہ تھا حضرت علیؑ کا انداز، حکومت کے بارے میں، اور اسی قسم کا طرزِ عمل امام حسنؑ نے ظاہر کیا کہ جنگ مغلوبہ جاری رکھ کر خون خرابہ برداشت کرنے کے بجائے بہتر یہ خیال کیا کہ دمشق سے

مصالحت کر لی جائے۔ وہ ان نقصانات کی ترازو میں برابر یا زائد نہیں تول رہے تھے جو جنگ جاری رکھنے کی صورت میں پورے معاشرے کو اٹھانے پڑتے خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جنگ کا نتیجہ دمشق کے حق میں نکلنے کے امکانات قوی تر تھے۔

لیکن اس سلسلے کی سب سے دلچسپ مثال وہ واقعہ ہے جو اس خانوادے کی ایک اور شخصیت امام جعفر صادقؑ نے پیش کی جبکہ اموی حکومت کے خلاف کامیاب بغاوت کے لیڈروں نے امامؑ کو نئی حکومت کا اقتدار پیش کیا۔ امامؑ نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور اقتدار میں آنے سے انکار کر دیا پھر تقریباً اس جیسی ہی صورت حال امام جعفر صادق کے پوتے امام علی رضاؑ کے ساتھ رونما ہوئی۔ جب مامون عباسی نے امامؑ کو اپنا جانشین بنانے کا عزم کیا۔ اس مرتبہ بھی اقتدار سے استکراہ کی وہی کیفیت نظر آئی جو اس سے پہلے اس خاندان کے اکابر کے طرز عمل میں برابر سامنے آئی۔

تو یوں تاریخ کا غیر جانبدارانہ فیصلہ یہ ہے کہ اس خاندان کے سوچ کے انداز میں اقتدار کسی مقصد کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ذریعہ رہا کچھ معاشرتی مقاصد کے حصول کا۔ اقتدار سے انکار ضروری نہیں کہ وہ بہتر مقاصد حاصل کرنے کا وسیلہ بھی بن سکتا ہے مگر اقتدار کے پیچھے دوڑنا غیر صحت مندانہ انداز ہے اس لئے کہ اقتدار بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ امام حسینؑ کے طرزِ عمل میں بھی یہی پہلو ہمیں نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے امام حسنؑ کے تلخ تجربات کے پیشِ نظر اقتدار سے بے تعلق رہنے کا فیصلہ کیا تھا اس لئے کہ اب دمشق اقتدار کو مقصدِ آخر قرار دے کر جنگِ اقتدار میں پوری طاقت سے آگے بڑھ رہا تھا اور بدقسمتی سے حالات اس کے سازگار بھی تھے۔ اس دوڑ میں امام حسینؑ شامل ہونے کو تیار نہ تھے چنانچہ یزید کے باپ کی زندگی میں انہوں نے سات سال کی طویل مدت بالکل خاموشی میں گزار

دی۔ یزید کے عہد میں بھی وہ اپنے طرزِ عمل کو نہ بدلتے۔ اگر دمشق بیعت پر اصرار کر کے فیصلہ کن مرحلہ سامنے نہ لے آتا۔

ایک جائزہ

بیعت پر ہم اس سے پہلے بھی سوچ آئے ہیں لیکن یہاں جس پہلو پر توجہ دینی ہے وہ یہ ہے کہ بیعت کا مطالبہ مسلم معاشرے میں اس حکمران کی طرف سے جو خود کو خلیفہ کہلواتا ہو، نظریاتی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اصولی طور پر خلیفہ صرف دنیوی حکمران کا نام ہی نہیں ہے معاشرے کے روحانی قائد کا نام بھی ہے پھر بات صرف اتنی ہی نہیں کہ اموی حکمرانوں نے اپنے اس نظریاتی مقام کو مبہم رکھا ہو بلکہ انہوں نے اس سلسلے میں فعال کردار بھی ادا کیا۔ اموی حکمرانوں نے یہ نظریہ متعارف کرایا کہ — خیر و شر — خدا کی طرف سے ہوتا ہے (خیرہ و شرہ من اللہ) بندے کی طرف سے نہیں۔ مطلب اس نظریے کا یہ تھا کہ ہر وہ اقدام جو بندہ کرتا ہے اس کیلئے وہ جواب دہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بندہ محض مجبور و معذور ہے اور ہر عمل کا فاعل خدا ہے لہٰذا کسی بھی معاملے میں بندے کو مسئول قرار نہ دیا جائے۔ خدا کو مسئول سمجھا جائے۔ یہ نظریہ (ڈاکٹرن) حکمرانوں کے لئے سیاسی طور پر بڑا مفید ثابت ہوا خصوصاً ایک مذہبی معاشرے میں جہاں عوام غیر شرعی حرکات پر بڑے منغض ہوتے تھے۔ خدا کی طرف ان حرکات کی نسبت کے بعد یعنی ان تمام حرکات کا فاعل خدا کو قرار دینے کے بعد حکمرانوں کو کھلی چھوٹ مل گئی کہ دن مظالم میں اور راتیں عیاشی میں گزار دیں۔ سیدھے سادھے لوگ صورتِ حال سے یہ سوچ کر مفاہمت کر لیتے تھے کہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ مثلاً ایک عیاش و ظالم شخص ان کا حکمران بنے اور جب مرضی الٰہی یہی ہے تو پھر بندے کا

فرض صرف یہ ہے کہ — مرضی حاکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور حکمرانوں کی غیر شرعی حرکات پر نکتہ چینی کے بجائے صرف اپنے اعمال سے سروکار رکھے۔ حکمرانوں کے بارے میں عوام کی اکثریت اس طرح کا اندازِ نظر رکھتی ہو تو سیاسی طور پر حکومت چلانے والوں کے لئے سب سے زیادہ قابلِ قبول ماحول مہیا ہو جاتا ہے۔ یہ اندازِ نظر اسی ڈاکٹرن (Doctrine) یعنی نظریئے سے منطقی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ خیر و شر اللہ کی طرف سے ہے، بندے کی طرف سے نہیں۔ اسلامی تاریخ میں حکمرانوں کے مظالم اور عیاشیوں کو برداشت کرنے کا رجحان اسی اندازِ نظر سے پیدا ہوتا ہے۔ آمریت کے لئے جو اپنی پناہ میں غیر مسئول ہوتی ہے۔ اس سوچ کی وجہ سے بڑی سازگار فضا پیدا ہوگئی۔ بنو امیہ کے اس خیر و شر اللہ کی طرف سے پیدا ہونے والے نظریے نے معاشرے کے دانشوروں میں سخت ردِعمل پیدا کیا اور انہوں نے مذہبی اکابر سے اس صورتِ حال کی پرزور شکایت کی، چنانچہ جناب حسن بصریؒ سے کئی حضرات نے اس خطرناک پروپیگنڈے پر احتجاج کیا تو موصوف نے اس نظریئے کی سختی سے مذمت کی اور کہا کہ اموی حکمران کذب بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ جو گناہ بھی وہ کرتے ہیں وہ خود ہی اس کے جواب دہ بھی ہیں اور خدا پر ان گناہوں کے ارتکاب کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ مصر کے ایک ممتاز فلسفی و مصنف ڈاکٹر علی سامی نشار کہتے ہیں کہ یزید نے جناب زینبؑ سے یہ کہا کہ تمہارے بھائی کو خدا نے قتل کیا ہے تو وہ دراصل اسی نظریئے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نشار نے یہ بھی بتایا ہے کہ عبدالملک ابن مروان کے عہد میں جب حضرت حسن بصریؒ کے اس فتوے سے سخت ردِعمل کا خطرہ پیدا ہوگیا تو ابن مروان نے روپئے کی ایک تھیلی جناب موصوف کو بھیج دی جس کے بعد انہوں نے اپنے اس خیال سے رجوع کر لیا۔

تاریخِ اسلام میں آمریت کے واحد نظامِ حکومت کے طور پر مقبول ہونے کے متعدد اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ نظریہ بھی بنا۔ حکومت کے مظالم کے مقابل اور طاقت کے سامنے سر جھکا دینے کا یہ اندازِ نظر جسے مذہب کی سینکشن (Sanction) توثیق خیر و شر اللہ کی طرف سے ہونے کے تصور نے مہیا کی۔ آمریت کے پھلنے پھولنے کے لئے بڑا سازگار ماحول پیدا کر دیا پھر آگے بڑھ کر حکمرانوں نے اس کے ساتھ یہ تصور بھی جوڑ دیا کہ — ہر نیک اور بد شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ (صلوا خلف کل بّر و فاجر)

اس بدخصلت کی وجہ سے حکمران کو فجر و فسوق پر عامل ہونے کے باوجود نماز پڑھانے یعنی سب سے اہم مذہبی فریضے کی ادائیگی میں امامت کی ذمہ داریاں انجام دینے کا حق مل گیا۔ ورنہ اگر مذہبی دائرے میں اس نوع کی سہولت نہ دی جاتی تو حاکموں کے لئے کم سے کم ظاہری طور پر متقی و پرہیز گار ہونے کا تاثر دینے پر مجبور ہونا پڑتا۔ ورنہ نماز کی امامت سے محرومی کا خطرہ مول لینا پڑتا تھا جو سیاسی طور پر شاہی اقتدار کیلئے خطرناک بن جاتا۔ اگر فسق و فجور کی بناء پر خلیفہ کے لئے امامتِ نماز ممنوع قرار دے دی جائے تو یہ فرض طبقہ علماء کے متقی افراد تک محدود رہ جائے گا اور یوں ان کی اہمیت مذہب کے سب سے اہم دائرے میں خلیفہ سے اونچی ہو جائے گی جو بادشاہ کے اختیار پر ایک طرح کی موثر روک (چیک Check) رہتی جبکہ فاجر کی امامت کا اصول مذہبی طور پر صحیح تسلیم کر لینے کی وجہ سے آمریت کو علماء سے جو ممکن خطرہ پیدا ہو سکتا تھا وہ دور ہو گیا۔ تو مسئولیت کے مسئلے کو حکمران کے بجائے خدا کی طرف منتقل کرنے کے نتیجے میں عوام کے حقِ اختلافِ رائے (Dissent) کو مذہبی اساس پر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ عوام کا یہ حق کہ وہ حکمران کو اس کی غلطی پر ٹوکیں، اس وقت عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ جب اختلاف بندے سے کیا جائے۔ اس وقت نہیں

جب اختلاف خود خدا سے کرنا پڑے اور یوں اس نظریئے نے عوام کو اس حق سے شرعی طور پر محروم کر دیا اور مختلف ملکوں میں بادشاہ کو الوہی اختیارات (Divine Rights) دے دیئے گئے۔

اموی تاجداروں نے بڑی چابکدستی سے شاہوں کے ان الوہی اختیارات کے تصور کو ایک نئے اور قابلِ قبول روپ میں متعارف کرایا اور عوام کے حقِ اختلاف کی زد سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ خود کو بچا لے گئے۔

روحانی قیادت

دمشق کے حکمران صرف شاہی کے دعویدار ہی نہ تھے خلافت کے مدعی بھی تھے۔ مطلب یہ کہ وہ صرف دنیوی حکمرانی پر ہی قانع نہ تھے، دینی قیادت کا ادا بھی کرتے تھے۔ خود لفظ بیعت روحانی سیادت تسلیم کرنے کا مفہوم رکھتا ہے۔ تاریخ اسلام میں بیعت صرف ان لوگوں نے لی ہے جو خود کو خلیفہ کہلاتے تھے۔ انہوں نے نہیں جو صرف سلاطین تھے۔ غوری و غزنوی خود بیعت کے طلبگار نہیں ہوئے اس لئے کہ وہ محض دنیوی حکمران تھے۔ دینی قائد نہ تھے لیکن دمشق، بغداد، قاہرہ اور قسطنطنیہ کے خلفاء بیعت کے ذریعے تخت پر آتے تھے اس لئے کہ وہ صرف دنیوی نہیں، دینی حکمرانی کے بھی مدعی تھے۔ یزید بھی اسی قسم کی حکمرانی کا دعوے دار تھا وہ صرف سلطان بنے رہنے پر قانع نہ تھا۔ خلیفہ ہونے پر بھی مصر تھا یعنی اصرار اس کا یہ تھا کہ مسلم معاشرہ اسے اپنا روحانی سربراہ تسلیم کرے۔ امام حسینؑ روحانی سربراہی کے اس دعوے کو ماننے سے منکر تھے۔ امامؑ کا موقف یہ تھا کہ یزید فاسق و فاجر ہے۔ اس لئے اس کی بیعت نہیں کی جا سکتی۔

ترجمہ اس کا کیا ہوا۔ ترجمہ یہی تو ہوا کہ بیعت روحانی سربراہی تسلیم کرنے کا نام ہے اور روحانی سربراہی کسی اس شخص کی تسلیم نہیں کی جاسکتی جو بنیادی روحانی اقدار پر عامل نہ ہو فاسق و فاجر ہو — آپ امام حسینؑ کے تمام اقوال کا مطالعہ کر ڈالئے کہیں آپ کو امام کا یہ قول نہیں ملے گا کہ یزید چونکہ فاسق و فاجر ہے اس لئے اس کی حکومت تسلیم نہیں کی جاسکتی، کے مفاہیم میں جوہری فرق ہے۔ فاسق و فاجر حکمران ہوسکتا ہے لیکن فسق و فجور پر عمل کرنے والا روحانی رہبری کا دعویدار نہیں بن سکتا۔ بیعت تو روحانی رہبری تسلیم کرنے کا نام ہے لیکن کسی کی حکمرانی تسلیم کرنے کا مطلب بیعت کر لینا نہیں ہے۔ وہی بات کہ حسینؑ یزید کی ڈی فیکٹو حکومت کو تسلیم تو کرتے تھے لیکن ڈی جوری تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔

اب صورتِ مسئلہ یہ پیدا ہوگئی تھی کہ یزید متعین مسلم اقدار پر عمل کرنے سے تو منکر تھا ہی ساتھ ہی بعض ایسے نظریوں کا مبلغ بھی تھا جن کے تسلیم کرنے کے معنی اسلام کی بنیادیں اکھاڑ دینے کے مترادف تھا۔ اصول اگر یہ بن جائے کہ ہر غلطی ہر اخلاقی قدر کے توڑنے کی جوابدہی خدا کو کرنی ہے بندوں کو نہیں گویا فسق و فجور کا ارتکاب بندہ نہیں خدا کرتا ہے تو پھر سارے اخلاقی نظام تلپٹ ہو کر رہ جائیں گے بلکہ اخلاقی نظام کا خود اپنا تصور ہی ختم ہو جائے گا۔ خیر و شر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے کے نظریئے کا واحد مقصد یہ ہے کہ گناہوں کی ساری ذمہ داری بادشاہوں سے ہٹا کر خدا پر ڈال دی جائے لیکن بندوں کو گناہوں کی جواب دہی سے بَری کر دینے کے بعد نہ مذہب کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ اخلاق کی۔ گویا امویوں کے اس نظریے کے نتیجے میں اسلام کی پوری بنیاد ہی اکھڑ کر رہ جاتی ہے۔

بہرحال یہ صغریٰ و کبریٰ آپ نے پڑھا یعنی آپ نے یہ پڑھا کہ یزید دنیوی حکمرانی کا ہی نہیں، دینی قیادت کا مدعی بھی ہے اور مدعی بھی اس حد تک کہ چند ایسے نظریوں

کی حمایت اور تبلیغ کیلئے بھی کوشاں ہے۔ جنہیں مان لیا جائے تو ہر اخلاقی نظام، ہر مذہب کی جڑ اکھڑ کر رہ جائے تو نتیجہ پھر بہ آسانی نکال لیجئے یعنی یہ کہ یزید کی بیعت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک حکمران کو جو فاسق و فاجر ہے اس لئے روحانی قائد مان لیا جائے کہ واقعی وہ خود فاسق و فاجر نہیں ہے کہ فاسق و فاجر بندہ نہیں ہوتا خدا ہوتا ہے۔ گویا امام حسینؑ کے اس موقف کا کہ فاسق و فاجر ہونے کی وجہ سے یزید کو روحانی قائد نہیں مانا جاسکتا اور اس لئے اس کی بیعت نہیں کی جاسکتی۔

دمشق کی طرف سے یہ جواب آیا کہ فسق و فجور کا ذمہ دار یزید نہیں خدا ہے لہٰذا اس کی بیعت سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ واضح طور پر امامؑ اس منطق کو تسلیم نہیں کر سکتے تھے اور اس لئے یہ بالکل یقینی تھا کہ بیعت کے معاملے میں دمشق سے تصادم ہو جائے۔

امام حسینؑ خاندانِ نبوت کے قائد تھے۔ ان کی طرف سے اس بات کا تسلیم کیا جانا کہ فاسق و فاجر روحانی حکمران بھی ہوسکتا ہے اس لئے کہ فسق و فجور کی جواب دہی خدا کو کرنی ہوتی ہے، بندے کو نہیں۔ اسلام کی ساری اخلاقی عمارت کو ڈھا دینے کے مترادف ہوتا اور واضح طور پر حسینؑ سے یہ ممکن نہ تھا۔ چاہے اس راہ میں کربلا کے مصائب کیوں نہ اٹھانے پڑ جائیں۔

مسائل پر ایک بار پھر سوچئے — مسائل یہ نہیں ہیں کہ تخت پر کون بیٹھے — مسئلے محض بنیادی و اساسی ہیں کہ اسلام ایک اخلاقی نظام ہے جو بندوں کو ان کی نیکی بدی کے لئے جواب دہ قرار دیتا ہے جو اچھے اور بُرے کاموں کیلئے جزا اور سزا مقرر کرتا ہے۔ اسلام کے اس سیاسی تصور کو وقت کی حکومت چیلنج کر رہی ہے اور بادشاہ کو ہر قسم کی رخصت دینے کے ساتھ ہر نوع کی جواب دہی سے محفوظ کرنے کا نظریہ بھی پیش کر رہی ہے پھر اس نظریے کو

منوانے اور بادشاہ کو روحانی قائد تسلیم کرانے کے لئے امام حسینؑ سے بیعت یعنی نظریئے کی صحت اور حکمران کی روحانی قیادت منوانے کی طالب بھی ہے۔

امام حسینؑ اسلام کے اخلاقی مزاج کے نمائندے تھے۔ اس لئے امامؑ کی بیعت لینے کا مطلب یہ ہوتا کہ اسلام کو اس کے گھر کے اندر گھس کر شکست دے دی گئی۔ حسینؑ اسلام کے اخلاقی نمائندے ہیں۔ اس بات کو یزید دوسروں سے کہیں زیادہ جانتا تھا۔ یہ بات بلا سبب تو نہ تھی کہ یزید نے بیعت سے انکار کرنے والے چار حضرات میں سے صرف امام حسینؑ ہی کو بیعت پر مجبور کرنے کیلئے چنا، جبکہ اس کے باپ نے امامؑ کے ساتھ بہتر سلوک کا مشورہ اور بُرے سلوک کے خطرناک نتیجوں سے ڈرایا تھا۔ یوں کہیے کہ امام حسینؑ کے ساتھ کربلا میں اسلام بھی داؤ پر لگ گیا تھا۔ تخت کی جنگ سے بچنے کے لئے تو امامؑ نے کئی تجویزیں پیش کی تھیں۔ روضۂ رسولؐ پر عمر بھر عبادت میں گزارنے یعنی اقتدار کی جنگ سے بچنے کی صورت نکال دی تھی لیکن روحانی قیادت تسلیم کرنے کے یزید کے وعدے کو وہ کسی قیمت پر منظور کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس لئے اگر حسینؑ یزید کی بیعت کر لیتے تو بالفاظِ دیگر مطلب اس کا یہ ہوتا کہ اسلام نے یزید کی بیعت کر لی۔ اسلام سے بیعت کرانے کے لئے ہی یزید نے اپنی حکومت کی پوری طاقت حسینؑ کی بیعت کے ایشو (issue) پر مرکوز کر دی تھی اور جب امام حسینؑ شہید ہو گئے اور اسرائے اہلِ بیتؑ دمشق پہنچے تو وہ اشعار پڑھے جن میں اسلام سے اپنے انتقام کے جذبات کا صاف اظہار کیا گیا تھا۔

اختلافِ رائے

یہ تھا واقعۂ کربلا کا اخلاقی و مذہبی پہلو، لیکن اس کا ایک وسیع تر تہذیبی و سیاسی پہلو بھی ہے جو تمام مذاہب اور تہذیبی نظاموں کے لئے یکساں اطلاق رکھتا ہے۔ یہ پہلو ہے حق

اختلاف رائے (Right of Dissent)۔ حسینؑ تخت دمشق سے ان نظریوں سے اختلاف کا حق مانگتے ہیں جن پر یزید کی حکومت چل رہی تھی۔ حسینؑ نے کہیں یہ مطالبہ نہیں کیا کہ یزید تختِ حکومت چھوڑ دے۔ انہوں نے کسی بیان میں یہ نہیں کہا کہ دمشق کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی جائے۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا یعنی میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ دمشق کے وہ نظریے صحت پر مبنی ہیں جن کی وہ تبلیغ کر رہا ہے۔ حسینؑ صرف یہ کہتے ہیں کہ یزید حکمران ہو تو ہو مگر خلیفہ نہیں ہے یعنی وہ روحانی حکمران نہیں ہے۔ حسینؑ حکومت کے نظریوں سے اختلاف کا حق مانگتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے جدید عہد کے با اصول لوگ آمر حکمرانوں سے اختلاف کرنے کا حق طلب کر رہے ہیں۔ یہ حضرات جو منحرفین کہلاتے ہیں، تہذیبِ انسانی کا بڑا قیمتی اثاثہ ہیں۔ حسینؑ اور ایک حد تک سقراط ان منحرفین کے قائدین میں شامل ہیں اور ان لوگوں کے رہنما جن کا نعرہ یہ تھا۔

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

سقراط اور حسینؑ میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر نے تنہا قربانی دی تھی۔ جبکہ حسینؑ کی کربلا میں قربانیوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے جو حضرت مسلمؑ کی شہادت سے لے کر اہل بیتؑ کی اسیری کے اختتام تک متعدد سمتوں اور جہتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک فرق اور یہ بھی ہے سقراط کے شاگردوں نے رشوت دے کر بچ جانے کا مشورہ دیا تھا جس پر سقراط نے ان کی سخت زجر و توبیخ کی جبکہ امام حسینؑ نے اپنے ساتھیوں کو رات کے اندھیاروں میں چھپ کر چلے جانے کی رخصت دے دی تھی جسے انہوں نے قبول نہیں کیا اور اپنی قربانی پیش کرنے پر مصر رہے۔ ہم واقعہ کربلا کے سلسلے میں مختلف راہوں سے گزرے اور مسائل کے

مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا لیکن ان واقعات کے پیشِ نظر جو ہمارے سامنے آئے اس خیال کی تائید نہ ہو سکی کہ امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار تختِ حکومت کے قبضے کے مقصد سے کیا تھا۔ تاریخ میں ہمیں جتنی شہادتیں ملیں بلکہ یوں کہیے کہ امام حسینؑ نے بالتسلسل جو اقدامات کئے ان کے جائزے سے صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک بنیادی اصول کی خاطر بیعت کے مطالبے کو مسترد کر دیا گیا تھا لیکن اس ضمن میں بعض وقت روپیہ اور دولت کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے یعنی خیال یہ ہوتا ہے کہ ہاشمیوں اور امویوں کی جنگ روپیہ اور دولت کے حصول کی جنگ تھی اور یوں گویا کربلا کے پس منظر میں بھی زر کا عنصر ممکن ہے ایک موثر عنصر کی طرح موجود رہا ہو۔ ہاشمیوں اور امویوں کی جنگ کی داستان طویل ہے اور ہمارے موجودہ تجزیئے کے دائرے سے خارج۔ اس لئے اس مسئلے کو تو یہاں نہ چھیڑیئے۔ البتہ کربلا کے واقعے کا جہاں تک تعلق ہے، زر کے عنصر پر کچھ سوچ لینا مناسب ہوگا۔

مسلم معاشرہ جس انداز پر وجود میں آیا تھا اس کے تحت معاشرے کے اکابر کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ حسنؑ ومعاویہ معاہدے کے بعد دونوں بھائیوں امام حسنؑ وامام حسینؑ کو بھی وظائف ملتے تھے۔ دمشق کے حکمران ان وظائف کو یقیناً سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کرتے ہوں گے لیکن امام حسینؑ کے سلسلے میں یہ دباؤ بھی کارگر نہ ہو سکا اور یزید کے باپ کے پاس جو یہ ہتھیار تھا وہ بھی کند ثابت ہوا۔ اس لئے کہ امام حسینؑ یزید کے بادشاہ بننے سے پہلے بھی دمشق کے مطالبہ بیعت کو مسترد کرتے رہے تھے اور اس طرح وظیفے کی موجودگی حسینؑ کی اصول نوازی کو کچھ اور قیمتی، کچھ اور وزنی بنا دیتی ہے گویا مطالبہ بیعت کا استرداد وظیفے کے مادی ومالی نقصان کا باعث بھی بنا تھا۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ دمشق سے وظیفہ لینا کربلا کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے۔ صحت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس واقعے کے نتیجے میں داؤ پر

مال یا مال کا کچھ حصہ بھی لگ گیا تھا جس سے قربانی کا پلہ لازماً کچھ اور وزنی ہو گیا۔

صورتِ حال پر اگر ہم امام حسینؑ اور ان کے بھائی امام حسنؑ بلکہ حضرت علیؑ کے موقف سے سوچیں تو جو بات سامنے آئے گی وہ یہ ہے کہ وہ معاشرہ جس میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا بنیادی طور پر وہ ان کا اپنا ہی معاشرہ تھا۔ یہ معاشرہ ان کے گھر کی مساعی سے وجود میں آیا تھا، ان کے نانا نے بنایا تھا اس لئے انہیں اس معاشرے سے شکایت تو تھی، عداوت نہ تھی۔ وہ اس معاشرے کو سنوارنا چاہتے تھے اس لئے وہ ہر اشتعال انگیزی پر تلوار کھینچ کر کھڑے نہ ہو سکتے تھے، نہ ہوتے تھے۔ دمشق کا انداز مخالفانہ بھی تھا اور صحیح سمت سے یعنی اس سمت سے جس پر مسلم معاشرے کو چلنا چاہیے تھا، ہٹا ہوا بھی، تاہم حکمرانوں سے جو مسلم معاشرے کے عملاً نگراں بن گئے تھے۔ مواصلات کے سارے روابط توڑ دینا جلد بازانہ اور جذباتی اقدام ہوتا۔ وظیفے کا قبول کرنا ارتباط کو باقی رکھنے کی ایک سعی تھی۔ اس آخری ارتباطی رشتے کو توڑ دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ امام حسینؑ دمشق پر وہ ہلکا سا دباؤ بھی اب باقی رکھنا نہیں چاہتے جو حکمران طبقوں کو آخری اقدامات کرنے کی راہ میں ایک ہلکی سی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ وظیفہ لینے سے انکار کا صاف مطلب یہ تھا کہ امام حسینؑ نے دمشق کے خلافِ اعلان جنگ کر دیا ہے جبکہ دمشق کے اقدامات پر اب تک وہ پردہ پڑا ہوا تھا جسے یزید چاک کرنے والا تھا۔ حسینؑ اسلامی تاریخ کے اہم سنگِ میل پر کھڑے تھے۔ وہ اس مرحلے پر کوئی ایسا قدم نہ اٹھا سکتے تھے جو محض جذباتی ہوتا اور جس پر تاریخ کو ہلا دینے والے واقعات کے تسلسل کا نقطہ آغاز بن جانے کا الزام لگایا جا سکتا۔

تاریخ میں کربلا کے المیے تک پہنچنے والے واقعات کا فیصلہ کن نقطہ آغاز یزید کا وہ مطالبہ بیعت بنا ہے جس کے انکار کی سزا موت تجویز کی گئی تھی لیکن وظیفہ لینے سے انکار حسنؑ

معاویہ معاہدے پر عمل سے انکار کے مترادف ہونے کے ساتھ ساتھ امام حسینؑ کی طرف سے دمشق کے خلاف علی الاعلان مقابل آجانے کے مترادف بھی ہوتا۔ یزید کے سیاسی منظر پر آنے سے پہلے تک دمشق کے حکمران امام حسینؑ سے ڈائرکٹ کنفرنٹیشن (راست مقابلے) سے بچتے تھے۔ حسینؑ راست مقابلے کا آغاز کرنے کی ذمہ داری خود اٹھانا نہ چاہتے تھے اور یہ ذمہ داری بھی اموی خاندان کے کسی بیوقوف اور غیر محتاط شہزادے کو اٹھانے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ حسینؑ کی نظر میں وظیفے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وظیفے کی اس رقم کے ملنے کا یہ فائدہ ضرور تھا کہ امام حسینؑ اس رقم کو ان حقیقی محتاجوں تک پہنچا دیتے تھے۔ جن کی حکمرانوں تک رسائی نہ تھی اور جنہیں وظیفے دینے میں حکمرانوں کو کوئی سیاسی فائدہ نظر نہ آتا تھا ایک ایسا شخص جو ڈائریکٹ کنفرنٹیشن شروع ہونے پر اپنے مال ہی نہیں جان خاندان اور رفقاء سب کچھ داؤ پر لگانے پر تیار تھا۔ وظیفے کی رقم کو کیا اہمیت دے سکتا تھا۔ دراصل اس وظیفے سے انکار کرنے کی صورت میں تین بڑی خرابیاں پیدا ہوتی تھیں۔ وہ محتاج امداد سے محروم رہ جاتے تھے جن تک وظیفے کی یہ رقم امام حسینؑ کے توسط سے پہنچتی تھی۔ دوسرے راست مقابلہ، شروع کرنے کی ذمہ داری امام حسینؑ پر عائد ہوتی تھی، جب کہ ہوشمندی پر عمل کر کے منتقم مزاج یزید کو یہ ذمہ داری اٹھانے کا موقع دیا جا سکتا تھا اور تیسری اور سب سے زیادہ سنگین بات یہ کہ حسنؑ معاویہ معاہدے کو ختم کرنے کا اعلان حسینؑ کو کرنا پڑتا جب کہ یہ ذمہ داری بھی بیوقوف یزید اٹھانے کو تیار تھا۔ اس معاہدے کو توڑنے کے سلسلے میں یزید کے باپ کئی قدم اٹھا چکے تھے مگر معاہدے کے علی الاعلان اختتام کا اعلان انہوں نے بھی نہ کیا تھا۔ یزید مطالبہ بیعت کو موت کی سزا سے وابستہ کر کے یہ اعلان کرنے والا تھا۔ واضح طور پر اس اقدام کا انتظار انتہائی ہوشمندانہ اقدام تھا اور امام حسینؑ نے وظیفے کی رقم لینے

سے قبل از وقت انکار نہ کر کے نہایت گہری سیاسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا اور سارے بوجھ دمشق کے کاندھوں پر ڈال دیئے۔

تعلقات کے درجے

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تعلقات صرف اچھے یا بُرے ہوتے ہیں وہ مسئلوں کو بڑی سطحی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اچھے اور بُرے تعلقات کئی مراحل میں بٹے ہوتے ہیں۔ اچھے تو کتنے اچھے اور کس منزل کے اچھے اور بُرے تو کس درجے کے بُرے۔ جذباتی انداز کے فیصلے ہوں تو آپ کسی سے روٹھ کر بیٹھ سکتے ہیں، لڑ سکتے ہیں، جان کی قربانی دے سکتے ہیں مگر جہاں جذبات کے بجائے ہوش وخرد اور عقل وذہانت سے مسائل پر نظر ڈالی جا رہی ہو وہاں اختلاف اور اتفاق کے مراحل ومنازل دیکھنے پڑتے ہیں۔ دمشق کا خیال یہ تھا اور حکمران اسی انداز پر سوچتے بھی ہیں کہ وظیفے کا باقی رکھنا امامؑ پر ایک دباؤ باقی رکھنے کی صورت ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس وظیفے سے امامؑ پر کوئی دباؤ نہ پڑا تھا۔ دباؤ پڑتا تو یزید کے باپ بار بار جو مطالبہ بیعت کر رہے تھے اسے قبول کر لیا جاتا۔ مشکل یہ ہے کہ وہ تقریباً مختلف صنف کے افراد کے درمیان معاملہ تھا۔ دمشق والے ایک اور مٹی کے بنے تھے وہی مٹی جس سے جبابرہ عالم کی تخلیق ہوئی تھی جبکہ امام حسینؑ بالکل مختلف قسم کی شخصیت تھے۔ روپیہ اور اقتدار ان کے خیال میں دانۂ خردل سے زیادہ وزن نہ رکھتے تھے لیکن ہر سخن موقعہ و ہر نقطہ مقامے دارد — وظیفے سے انکار ویسے کسی اہمیت کا حامل نہ تھا بہ آسانی کیا جا سکتا تھا۔ اصل سوال تو ان سیاسی نتائج کا تھا جو انکار سے پیدا ہو سکتے تھے۔ حسینؑ وظیفے کو قبول کر کے خود دمشق پر اپنا دباؤ باقی رکھے ہوئے تھے۔ دباؤ باقی رکھنے کا مطلب کیا ہے؟ وظیفہ قبول کرنے سے انکار واضح طور پر

ہر قسم کا تعلق توڑ لینے کا اعلان ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک طرح کا اعلان جنگ ہوتا اور امامؑ دمشق کو آخری تعلق کے انقطاع کا یہ سگنل دینا نہ چاہتے تھے، نہ دینا چاہئے بھی تھا۔ اس لئے کہ ایک تو تخالف کو تصادم کی حد پر لانے کی ذمہ داری قبول کرنا کوئی ہوش مندانہ بات نہ تھی۔ دوسرے تصادم کو آخری وقت تک روکنا ہر اعتبار سے مناسب تھا۔ پہلے دمشق خود تصادم کے نقطے پر آنے کو تیار نہ تھا اس لئے قدرتاً امام حسینؑ کا وظیفہ لینے پر راضی رہنا خونریزی اور تصادم کو روکنے کی معقول صورت تھی۔ وظیفہ قبول کرتے رہنے کا مطلب یہ تھا امامؑ آخری تصادم تک پیش قدمی کرنے کی ذمہ داری دمشق پر ڈالنا چاہتے تھے۔ یوں ایک قسم کا دباؤ تھا جو دمشق پر پڑ رہا تھا۔ دباؤ یہ تھا کہ دمشق خونریزی کی سمت بڑھنے سے بچا رہے — اگر امامؑ وظیفہ لینے سے صاف انکار کر دیتے تو دمشق کو آخری قدم اٹھانے سے روکنے کیلئے جو دباؤ باقی تھا باقی نہ رہتا اور — خونریزی کی منزل فوراً سامنے آ جاتی۔ اس طرح امام حسینؑ نے آخری وقت یعنی یزید کے تخت پر بیٹھنے تک خونریزی کو روکنے کیلئے جو صحیح تر سیاسی لائن اختیار کی وہ نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور یزید کے حکمران بننے تک امام حسینؑ اور دمشق کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہونے کے باوصف بالکل منقطع ہونے کے نقطے تک نہ پہنچ سکے۔ یہ سب کچھ امام حسینؑ کی غیر معمولی حد تک ہوشمندانہ اور گہری سیاسی سوجھ بوجھ کی بناء پر ممکن ہو سکا، ورنہ کوئی جذباتی لیڈر ہوتا تو دمشق کی اشتعال انگیز معاہدہ شکنیاں پہلے ہی اختلاف کو تصادم کے نقطے پر لے آتیں۔ تو ان پہلوؤں کے جائزے کے بعد ہم کس نتیجے پر پہنچتے ہیں؟ کیا اس نتیجے پر نہیں کہ وظیفے کی رقم کوئی بنیادی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اہم بات وہ وسیع تر سیاسی مقاصد تھے جو آخری تصادم کو روکنے کے سلسلے میں امامؑ کے پیش نظر تھے جو شخص بیعت کے فیصلہ کن مطالبے کے وقت سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار تھا۔ اس کیلئے دمشق سے تصادم مول لے لینا

کسی وقت بھی مشکل نہ تھا۔ چاہے معاملہ یزید سے لڑ پڑے یا اس کے باپ سے۔ لیکن یزید کے باپ کے عہد میں شہادت اور قربانی کا خمیر پوری طرح اٹھا نہ تھا اور حسینؑ اپنی طرف سے کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہ تھے کہ یہ خمیر ان کے کسی اقدام کے نتیجے میں پوری طرح اٹھ آتا اور تاریخ یہ فیصلہ دے دیتی کہ اگر امامؑ وظیفہ لینے سے انکار نہ کرتے یعنی اپنی طرف سے حسنؑ معاویہ معاہدہ توڑنے کا اعلان تو واقعہ کربلا رونما نہ ہوتا۔ یاد رہے کہ واقعہ کربلا امامؑ کے وظیفہ قبول کرنے سے انکار کے نتیجے میں لازماً رونما ہو جاتا اس لئے کہ یہ انکار امامؑ کی طرف سے اعلانِ جنگ کے مترادف سمجھا جاتا اور مترادف ہوتا بھی اور پھر یزید کے باپ بھی جو بیٹے کی بہ نسبت محتاط تھے، وہ قدم اٹھانے میں نہ ہچکچاتے جو امامؑ کی طرف سے سکوت اور کسی غیر مخالفانہ اقدام کے عمل میں نہ آنے کی وجہ سے نہ اٹھا رہے تھے۔ مطلب مختصراً یہ کہ امام نے آخری تصادم اور خونریزی ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے وظیفے کو صرف اس لئے برداشت کیا کہ ان سے انکار صورتِ حال کو کشیدگی کے آخری نقطے تک لے جانے کا باعث بن جاتا اور امامؑ کشیدگی کو آخری نقطے تک جانے کی ذمہ داری خود اٹھانے کو تیار نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے ان باریک پہلوؤں کا خیال سیاست کو اخلاقی سطح پر سوچنے کا انداز تھا اور مفصل غیر جانبدارانہ جائزے کے بعد ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ امام حسینؑ نے سیاسی عمل کو اخلاقی سطح پر باقی رکھنے کا جو کارنامہ انجام دیا ہے تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے۔

اور — دس محرم

دس محرم کا سورج ایک ایسے دن نکلا تھا جس کے چند گھنٹوں نے تاریخ کی رفتار کو بدل کر رکھ دیا۔ صبح سے لے کر شام تک انسانی صدیوں کا سفر طے کر گئی۔ تاریخ بار بار ان

سنگِ میل سے گزری ہے جن سے نئے راستے پھوٹتے رہتے ہیں — اس دن ہر لمحہ ایک نئے سنگِ میل کے طور پر آیا اور گزر گیا اور یوں کوئی چھ سو منٹ قربانیوں کی وہ لڑیاں پرو گئے جو طویل صدیاں ایک ایک دانہ جمع کر کے مکمل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔

سانحۂ کربلا مظلومیت کی دل ہلا دینے والی داستانوں کے مجموعے سے عبارت ہے لیکن تاریخ نے مظلومیت کی اور المناک داستانیں بھی سنی ہیں۔ لیکن واقعہ کربلا اصولوں کے لئے قربانیاں پیش کرنے سے عبارت ہے لیکن انسانوں نے اصولوں کے لئے اپنی جانیں پیش کرنے کے اور کارنامے بھی انجام دیئے ہیں۔

کربلا بربریت آمیز مظالم کی المناک جسارتوں پر مشتمل ہے لیکن حیوان نما انسانوں نے بہیمیت کے شاہکار پیش کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

تو پھر — آپ اپنے ذہن سے یہ پوچھیں کہ — کربلا وہ کیا اختصاص رکھتی ہے جو انسان کی تہذیبی جدوجہد کی داستان میں اسے ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے؟

کربلا یہ سب کچھ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا مگر اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ جو ذکر و بیان میں ذرا کم ہی آتا ہے۔ دانتے (DANTE) نے ڈوائن کامیڈی (Divine Comedy) لکھی۔ اس کا انداز اور مسائل دوسرے ہیں لیکن نام کی حد تک آپ چاہیں تو سانحہ کربلا کو ڈیوائن ٹریجڈی (Divine Tragedy) کہہ سکتے ہیں۔ ڈوائن ٹریجڈی اس معنیٰ میں کہ کربلا اخلاقی زندگی کا وہ شعوری سفر ہے جس میں انسانی معاشرت کے وہ تمام رشتے موجود تھے جو مختلف یادگار المیوں میں جدا جدا ملتے ہیں۔ یونان کی ٹریجڈی ایک ناگزیر نقطے تک پہنچتی ہے۔ ایک ایسے مقدر تک جسے دیوتا بھی نہیں بدل سکتے لیکن کربلا کی ٹریجڈی اپنے آغاز سے انجام تک ایک شخص کی — نہ — اور — ہاں پر منحصر رہی۔ تاریخ کے

سارے المیے اپنے فیصلہ کن لمحے پر پہنچے اور ختم ہو گئے لیکن حسینؑ کا المیہ، فیصلہ کن نقطے پر پہنچا اور آگے بڑھ گیا اور پھر ایک اور — ایک اور فیصلہ کن نقطہ آیا اور گزر گیا اور ہر مرحلے پر ہاں — اور — نہ — کا فاصلہ جتنا پہلے تھا اتنا ہی آخر وقت تک باقی رہا۔ دوسرے تمام واقعات کو چھوڑ کر حضرت علی اصغرؑ کے ایک خوں آشام تیر سے شہید ہونے کا سانحہ ہی لے لیجئے جس نے تاریخ کے ضمیر کو ہلا کر رکھ دیا۔ لیکن تاریخ کا یہ سنگِ میل بھی آیا تو بیعت کی ہاں اور — نہ — کا مسئلہ فیصلہ کن سوال کی طرح آ کھڑا ہوا اور حسینؑ وہیں کھڑے رہے، جہاں پہلے کھڑے تھے۔ کم سے کم بہتر تو واضح سنگِ میل صبح سے شام تک آئے مگر حق اختلاف رائے یعنی ایک پُرامن شہری کے اس حق کے تحفظ کا مسئلہ کہ وہ بے اصولی کو اصول سمجھنے پر راضی نہ ہوگا۔ ہر مرحلے پر سامنے آ گیا۔ بیعت کے مطالبے سے لے کر اسرائے اہل بیتؑ کی رہائی تک شروع میں طویل وقفے کے ساتھ اور آخر میں تیز تیز ہر لمحے فیصلے کی گھڑیاں آئیں اور گزر گئیں — مگر حسینؑ اور ان کے اعزاء اس موقف پر جمے رہے جو انہوں نے پوری شعوری سنجیدگی کے ساتھ طے کر لیا تھا۔

لیکن نہیں — ذرا رک جائیے —! — آج دس محرم ہے۔ تاریخ کا طویل ترین دن۔

(۲) دوپہر گزر چکے تھے کہ شہادت حسینؑ کا خونچکاں سانحہ رونما ہوا لیکن بات اس نقطے پر آ کر نہ رکی بلکہ واقعات اپنی بربریت اور بہیمیت میں زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے۔ لاشیں پامال کر دی گئیں اور خیمے لُوٹ لئے گئے — پھر اس کے بعد تشہیر اور توہین کی المناک داستان شروع ہوئی جو کوفے کے بازاروں اور گورنر کوفہ و بصرہ کے دربار سے گزر کر دمشق کی شاہراہوں اور ایک عظیم سلطنت کے حکمرانوں کے اجتماع میں جسے دربار یزید کہا جاتا ہے

اختتام پذیر ہوئی۔

یہاں امام حسینؑ کی بہن جناب زینبؑ نے وہ تاریخی خطبے دیئے جنہوں نے دمشقی بیوروکریسی کے اس پروپیگنڈے کا پردہ چاک کر دیا کہ یہ قافلہ اسرائے ویلم پر مشتمل ہے جنہیں مسلمان فوجیں گرفتار کر کے لائی ہیں۔

دس محرم کے دن میں چند گھڑیاں باقی رہ گئی تھیں کہ امام حسینؑ شہید ہوئے۔ امامؑ نے آخر تک دفاعی اقدامات کیے تھے تاکہ وہ خون کربلا میں نہ بہنے پائے جس نے تاریخِ اسلام کو سرخ بنا کر رکھ دیا۔ امامؑ نے آخر وقت تک حیرت انگیز تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بات کی پوری کوشش کی کہ وہ حکومت جو خود کو مسلمان کہلانے پر اصرار کرتی ہے اس سنگین جرم کے ارتکاب سے بچ جائے۔ جس کا نام واقعہ کربلا ہے لیکن بار بار کی پند و نصیحت، فہمائش اور سیاسی طور پر قابلِ قبول متبادل صورتیں سمجھانے کے باوصف یزیدی فوج کے لیڈر اپنی شرمناک حماقت مآبی سے باز نہ آئے اور وہ گناہ کر ہی بیٹھے جس سے امامؑ شام کے حکمرانوں کو بچانا چاہتے تھے۔ لیکن ضمیر کی ٹیڑھ اور اقتدار کے جنون میں عظیم سانحہ رونما کر دیا گیا اور اب ساری صورتِ حال ہی بدل کر رہ گئی۔ یہ وہ نقطہ تھا جہاں نیکی کی قوتوں کی قیادت امامؑ کی عظیم بہن جناب زینبؑ نے سنبھالی چنانچہ انقلاب کی کھل کر تبلیغ شروع کر دی گئی۔ جناب زینبؑ نے کربلا سے کوفے اور کوفے سے دمشق تک رائے عامہ کو اصل حقائق سے آگاہ کرنے کیلئے جو خطبات دیئے، انہوں نے تختِ دمشق کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ خود دمشق میں بھی ہیجان برپا ہو گیا جس کے نتیجے میں حکمران اسرائے اہلِ بیتؑ کو زیادہ عرصے قید و بند میں رکھنے پر قادر نہ ہو سکے۔

یزید کی حکومت جو انتقام کے جذبے کی تسکین پر اپنی خوشیاں چھپانے میں

کامیاب نہ ہو رہی تھی۔ ایک اور سنگین ترین حماقت کی مرتکب ہوئی۔ ولید کی جگہ عمر بن سعید ابن عاص مدینے کا گورنر بنایا گیا تھا۔ دمشق نے اپنی فتح کے جنون میں قتلِ حسینؑ کی خوش خبری جلد تر گورنر کو پہنچائی جس نے یزید کے منشاء کا اتباع کرتے ہوئے سارے مدینے میں اس خوش خبری سے متعلق ڈونڈی پٹوادی اور اس اعلان کا فرض خود دمشق کے قاصد عبدالملک نے انجام دیا۔ جس نے نہ صرف یہ کہہ کر حاکم کو واقعہ کربلا کی اطلاع دی بلکہ خود ہی مدینے کے کوچہ و بازار میں گھوم کر شہادت حسینؑ کی اہلِ مدینہ کو اطلاع بہم پہنچائی لیکن اسی عبدالملک کا بیان ہے کہ مدینے میں بنی ہاشم کے گھروں سے یہ اعلان سننے کے بعد گریہ وزاری کا جو شور بلند ہوا وہ اتنا پُر زور تھا کہ میں نے عمر بھر ایسے رونے کی آواز نہ سنی تھی۔

سنگین حماقت

یہ بحث ہم پڑھ چکے ہیں کہ یزید نے بیعت کا مطالبہ اس انداز میں پیش کر کے کہ اس کا انکار مستوجبِ موت بن جائے، واقعۂ کربلا کی ساری ذمہ داری خود اٹھالی۔ لیکن یہ گھناؤنا ظلم کر کے بھی اسے ہوش نہ آیا — ہوش کیا آتا وہ اپنی جنون مآبی اور نادانی میں کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ کربلا کے دہشت ناک المیے کو اپنی فتح مندی کا شاہکار قرار دے کر اس نے اس واقعے کی تشہیر شروع کر دی جس کا چھپانا اس کے اپنے مفاد میں تھا واضح طور پر یہ وہ وقت تھا جب کربلا کا سانحہ رونما ہوئے تھوڑی ہی مدت گزری تھی یعنی جناب زینبؑ کی طاقتور عوامی خطابت نے رائے عامہ کو منظم کرنے کا عمل شروع ہی کیا تھا۔ ادھر جناب زینبؑ نے اپنی طرف سے بھرپور تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ادھر یزید نے پہل کر کے اپنے جذبہ انتقام کو تسکین دینے کے لئے مدینہ میں اپنی فتح مندی کا ڈھنڈورا پٹوادیا۔

دمشق تو اپنی عداوت کی آگ بجھا رہا تھا یہ سمجھے بغیر کہ واقعۂ شہادت امامؑ کی یہ خبر کیا نتیجے پیدا کرے گی مگر عوام جنہیں یہ خبر دی گئی تھی انتہائی معاندانہ ردعمل دے کر اٹھے اور 62ھ میں شرفائے مدینہ کا ایک وفد صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے شام روانہ ہوگیا۔ وفد نے دمشق میں قیام کیا اور تمام حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رپورٹ دی کہ —

''ہم ایسے شخص کے پاس سے آرہے ہیں، جو کوئی مذہب نہیں رکھتا، شراب پیتا ہے، طنبورہ بجاتا ہے، گانے والیوں سے گانا سنتا ہے اور کتوں سے کھیلتا رہتا ہے اور رندوں بدمستوں کے ساتھ قصہ گوئی میں اوقات صرف کرتا ہے چنانچہ ہم سب اس کی بیعت کا قلاوہ اپنی گردن سے اتار پھینکتے ہیں۔''

یاد رہے یہ رائے اس وفد کے ارکان نے ظاہر کی ہے جسے دمشق نے خاموش رکھنے کے لئے کافی رقمیں دی تھیں — یہ بات ابنِ اثیر نے اپنی تاریخ کامل میں لکھی ہے۔ اس سلسلے میں سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں یہ اشارہ کیا ہے کہ وفد کے ارکان نے یہاں تک کہا کہ —

''ہم نے یزید کی مخالفت اس وقت اختیار کی جب ہمیں اس بات کا اندیشہ پیدا ہوگیا کہ ہم پر عذاب الٰہی کے طور پر آسمان سے پتھر برسیں گے۔ اس لئے کہ وہ ایسا شخص ہے جو اپنے باپ کی تصرف کردہ کنیزوں یعنی (سوتیلی ماؤں) بیٹیوں اور بہنوں تک کو اپنے لئے حلال سمجھتا ہے، شراب پیتا اور نماز کو ترک کرتا ہے۔''

اپنی اصلی بحث پر لوٹنے سے پہلے جو بات توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ وفد نے اپنی

رپورٹ میں یزید کی حرکات کا ذکر کرنے کے بعد جو فیصلہ دیا وہ یہ تھا —

''ہم سب یزید کا قلادہ اپنی گردن سے اتار ڈالتے ہیں۔''

آپ نے! توجہ فرمائی بات کیا نکل کر آئی۔ بات یہ نکل کر آئی کہ یزید بیعت کا مستحق نہیں ہے۔ کیوں مستحق نہیں ہے — ؟ اس لئے کہ وہ ان حرکات کا مرتکب ہے جو مسلم معاشرے کے آئیڈیل کی ضد ہیں اور اگر بیعت کا قلادہ اتار نہ پھینکا گیا تو نسلِ انسانی پر خدا کا قہر نازل ہوگا۔ مزید توجہ اس بات پر دیجئے کہ ارکانِ وفد نے یزید کے خلاف بغاوت کا اعلان کرنے کے بجائے صرف قلادہ بیعت اتارنے کا اعلان کرنے پر اکتفا کیا اس لئے کہ خلیفہ کی بیعت میں رہنا ایک خالص روحانی موقف ہے جس کا تعلق آئیڈیل سے ہے۔ اگر اسلامی حکومت کا قائد ایک آئیڈیل کا نمائندہ ہونے کا مدعی بھی ہو اور اس ادعا کے نتیجے میں بیعت یعنی روحانی تقلید کرنے کا مطالبہ بھی کر رہا ہو اور ساتھ ہی آئیڈیل کے پرخچے بھی اڑا رہا ہو تو ایک باخبر شخص کے لئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں یا تو یہ کہ بیعت سے صاف انکار کر دیا اور یا بیعت کر چکا ہو تو قلادہ بیعت اتار پھینکے۔ اول الذکر کام حسینؑ نے کیا اور ثانی الذکر مدینے کے اس وفد کے ارکان نے — فرق ہوا تو اس قدر کہ مدینے کے ارکان وفد غفلت و بے خبری میں کئی مہینے یزید کو روحانی قائد تسلیم کرتے رہے جبکہ حسینؑ کے دامن پر ایک آئیڈیل دشمن شخص کی روحانی قیادت تسلیم کرنے کا الزام ایک لمحے کیلئے بھی نہ لگ سکا۔

ویسے کہنے کو تو یہ عام سا فرق ہے تاہم غور سے دیکھا جائے تو دونوں صورتوں میں جو فرق رونما ہوا اسی میں کربلا کا عظیم ترین تاریخی سانحہ حائل تھا۔ کتنا بڑا فرق ہے صورتِ حال کے دونوں پہلوؤں میں۔ ایک اور فرق بھی ہے جسے آپ نظر انداز کر کے آگے نہ بڑھ جائیں — امام حسینؑ نے یزید کی تخت نشینی کے بعد اور مطالبہ بیعت سے پہلے کوئی ایسا اعلان نہیں کیا تھا کہ وہ

بیعت یزید سے منکر ہیں۔ انکار کی یہ منزل اس وقت آئی جب یزید کی طرف سے بیعت کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ یہ نہیں کہ امام نے اپنی طرف سے اعلانِ انکارِ بیعت کر دیا ہو۔ مدینے کے وفد کا طرزِ عمل اس سے مختلف ہے۔ انہوں نے پہلے بیعت کر لی تھی اور پھر جب حالات سے واقفیت حاصل کی تو قلادۂ بیعت اپنی گردن سے اتار پھینکا۔

دمشق کے حکمرانوں نے یقیناً اس اقدام کو بغاوت سے تعبیر کیا ہوگا اس لئے کہ وہ یزید کی خلافت یعنی روحانی قیادت پر مصر تھے۔ یزید کے نقطہ نظر سے افراد یا عوام کے طرزِ عمل کے تین مرحلے تھے۔ پہلا یہ کہ بیعت کر کے توڑ دی جائے جو واضح بغاوت کی علامت ہے۔ دوسرا یہ کہ یزید کی تخت نشینی کے وقت بیعت سے انکار کا اعلان کر دیا جائے، یہ بھی بغاوت کی ایک صورت تھی اور تیسری یہ کہ یزید کے تخت پر بیٹھنے کے بعد خاموش رہا جائے۔ یہ تیسری صورت حکومت کے نقطہ نظر سے سب سے زیادہ قابل قبول تھی اس لئے کہ اس میں حکومت کے لئے کوئی فوری خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ البتہ تینوں صورتوں کے دائرے سے باہر جو صورت آتی ہے وہ حکومت وقت کی حمایت و تائید کی تھی۔ ان تینوں صورتوں میں، امام حسینؑ نے تیسری صورت اختیار کی۔ امامؑ نے کوئی بیعت نہیں کی جو قلادۂ بیعت اتارا ہو۔ نہ اپنی طرف سے اعلان انکار بیعت کیا۔ کیا تو یہ کہ خاموشی اور سکوت اختیار کیا اور یزیدی حکومت کیلئے براہِ راست کنفرنٹیشن (مقابلہ) کرنے سے بچنے کا راستہ کھلا رکھا۔ امام حسینؑ یزید کی بیعت نہ کر سکتے تھے۔ یزید کی بیعت بے لڑے شکست کھا جانے اور روحانی خودکشی کرنے کے مترادف ہوتی اور اس کی توقع کسی اور سے تو کی جا سکتی تھی حسینؑ سے نہیں۔ یوں کہیے کہ حسینؑ اپنے حقِ اختلاف کو محفوظ کر کے براہِ راست مقابلے سے بچنے کے لئے دمشق کو موقع دے رہے تھے۔ ہر چند ایک نہایت بالغ سیاسی مبصر کی طرح امامؑ اس مستقبل کو جانتے

تھے جو پیش آنے والا تھا چنانچہ بڑی وضاحت کے ساتھ انہوں نے مستقبل کی پیش بینی کر دی تھی۔ وہ بتا چکے تھے کہ یزیدی کس حد تک جا سکتے ہیں اور کس حد تک جائیں گے۔ تاہم ان تمام اقدامات سے حسینؑ نے اجتناب کیا جو ڈائریکٹ کنفرنٹیشن تک لے جاتے تھے اور جو اس ڈائریکٹ کنفرنٹیشن کی ذمہ داری امامؑ پر ڈالنے کا سبب بن جاتے۔

یزید میں ذرا سی سیاسی سوجھ بوجھ ہوتی یا وہ اپنے جذبۂ نفرت و عداوت میں دیوانہ نہ ہو چکا ہوتا تو ڈائریکٹ کنفرنٹیشن سے بچ نکلتا۔ جس طرح اس کے باپ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ امام حسینؑ اس کے باپ کو بھی براہِ راست مقابلے سے بچنے کی راہ چھوڑ دیتے تھے چنانچہ وہ اس رخصت سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اس لئے کہ ان میں جذبۂ عداوت و نفرت پر قابو پانے اور سیاسی مصالح کو سمجھنے کی اہلیت تھی لیکن بیٹا جو جذباتِ عداوت اور انتقام میں دیوانہ ہو رہا تھا اندھا دھند اس وادی میں چھلانگ لگانے پر تیار ہو گیا جہاں شیطان بھی قدم بڑھانے میں ہچکچا جاتا۔ آخر یہ پاگل پن نہ تھا تو کیا تھا کہ ایک تو نواسۂ رسول کو شہید کیا، ان کے خاندان پر مظالم توڑے اور دوسرے خود ہی اس گھناؤنے جرم کا ڈھنڈورا پیٹنے بیٹھ گیا نتیجہ صاف تھا، مدینے میں سانحۂ کربلا کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی جو پورے شہر میں ڈونڈی پیٹنے کا قدرتی نتیجہ تھا چنانچہ عوام سڑکوں پر نکل آئے۔ بغاوت نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مدینے کے اموی گورنر کو شہر سے بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔

سنگین ترین بحران

عوام کی اس بغاوت کے جواب میں دمشق نے پھر شرمناک اور مجرمانہ ردعمل دینے کی حماقت کی اور مدینے میں اس پیمانے کا قتل عام کیا گیا جس کی مثال تاریخ میں خال

خال ہی ملتی ہے۔ پورے مدینے کی آبادی جس میں بچے، جوان، بوڑھے اور عورتیں سب ہی شامل ہیں فوج یزید کے لئے مباح کر دی گئی۔

تین دن تک مسلسل یہ قتل عام رہا بلکہ بیان کرنے والے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مدینے میں اس قدر خوں ریزی ہوئی کہ مسجد رسول کے پاس گھٹنوں گھٹنوں خون بہہ رہا تھا اور عورتوں کی اتنی بے حرمتی کی گئی کہ اس واقعے کے کافی عرصے بعد تک کوئی باپ اپنی لڑکی کی بکارت کی ضمانت دینے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ حد ہے تین دن کی مکمل لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے بعد جو لوگ بچے انہیں یزید کا غلام بنا لیا گیا یعنی یہ کہ ان سے اس بات پر بیعت لی گئی کہ یزید ان کے اہل و عیال کا مالک و مختار ہوگا۔ ظاہر ہے یہ سب قیدی مسلمان تھے، تاہم انہیں غلاموں کے درجے پر لے آیا گیا پھر کمال دیکھئے کہ مدینے کے محترم مسلمان قائدین کے گھرانے کی عورتوں اور بچوں کو غلاموں کی طرح فوجیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ غلاموں کی طرح بیعت لینے کے اس طریقے پر ام المومنینؓ کے نواسے یزید ابن عبداللہ ابن ربیعہ ابن اسود نے احتجاج کیا، غلامی پر دلالت کرنے والے الفاظ کے ساتھ بیعت کرنے سے انکار کر دیا تو انہیں فوراً قتل کر دیا گیا۔ یہاں یہ خوش فہمی کہ یہ سب کچھ حرکتیں صوبائی انتظامیہ کی ہوں گی۔ یزید نے خود ہی دور کر دیں۔ چنانچہ ان واقعات کی دمشق کے حکمران کو اطلاع ملی تو وہ خوشی میں پھولا نہ سمایا اور انہی جذبات کا اظہار کیا۔ جن کا شہادتِ امام حسینؑ پر کر چکا تھا۔ یزید نے یہ اشعار پڑھے۔

لیت رشیاخی ببدر شھدو جزع الخزرج من وقع الاسل
حسین حکت بقباد برکھا واستحرا القتل فی عبدالاشل

مطلب یہ کہ اہل مدینہ سے یہ سلوک بھی پیغمبرؐ اسلام سے انتقام ہی کے سلسلے میں

تھا۔ یہاں بھی جنگ بدر میں ہار کا مسئلہ ہی یزید کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔

مدینے کا یہ المیہ جو مختصراً اوپر بیان کیا گیا اپنے کئی پہلوؤں میں بے مثال ہے مگر اتنا ہی یا اس سے بھی کچھ سنگین سانحہ مکے میں رونما ہوا۔ حادثہ کربلا کا دھماکہ دور دور تک سنا گیا۔ پھر جناب زینبؑ کی تقریروں نے رائے عامہ کو مسلم معاشرے کے سنگین ترین بحران سے باخبر رکھنے میں فیصلہ کن پارٹ ادا کیا تھا۔ دمشق اور مدینے ہی نہیں کوفے اور مکے نیز دوسرے مقامات پر بھی عوامی اشتعال دور دور تک پھیل گیا۔ اس سازگار فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عبداللہ ابن زبیر نے سانحہ کربلا کے انتقام کا علم اٹھا کر مکے میں یزید کے خلاف بغاوت کر دی۔

آپ کو یاد ہے کہ یزید کے باپ نے ان عبداللہ ابن زبیر کے بارے میں کیا وصیت کی تھی۔ یزید نے امام حسینؑ اور عبداللہ ابن زبیر دونوں کے بارے میں باپ کے سیاسی مشورے کو نہ سنا اور بالکل برعکس قدم اٹھا کر وہ سیاسی حماقتیں کیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ تختِ شام خاندانِ امیہ سے نکال دیا بلکہ پورے امویوں کے خلاف ایسی نفرت پیدا کر دی کہ سات سال نہ گزرنے پائے کہ مسلمانانِ عالم نے حکومت تو کیا خود امویوں کا بیج ہی مشرق سے اکھاڑ پھینکا۔ بمشکل انہیں اسپین میں پناہ مل سکی۔

واضح طور پر باپ کا مشورہ اخلاقی وجوہ کی بناء پر نہ تھا مذہبی اسباب کی بناء پر بھی نہ تھا محض سیاسی مصالح کے پیش نظر تھا۔ ان کا سیاسی تجربہ یہ تھا کہ امام حسینؑ حکومت کیلئے کوئی خطرہ نہیں ہیں البتہ عبداللہ ابن زبیر ضرور خطرہ ہیں۔ لیکن یزید جو آنحضرتؐ کی ذات اور مشن سے انتقام لینے کی آگ میں جل رہا تھا، سیاسی مصالح کی واضح ضرورتوں کی نمایاں اہمیت کے باوجود اپنے منتقمانہ جذبات پر قابو نہ پا سکا۔

یہ نہیں کہ یزید چالوں یا ضروریات سے ناواقف تھا وہ اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے ہر مناسب موقع سے فائدہ اٹھاتا لیکن اس کی سیاسی ضرورتوں کی ذہانت معطل ہو کر رہ جاتی۔ جب امام حسینؑ کا معاملہ آتا تھا۔ عبداللہ ابن زبیر نے مکے میں اعلان خلافت کیا، جسے عبداللہ ابن عباسؓ نے تسلیم نہ کیا تو یزید نے فوراً انہیں ایک مبارکبادی کا خط لکھا جس میں اظہارِ اطمینان کے بعد ان سے درخواست کی گئی کہ ابن زبیر صاحب کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرے۔ آخر میں انہیں بہت سے اکرام وانعام کا لالچ بھی دیا گیا تھا یہ اور بات ہے کہ جناب عبداللہ ابن عباسؓ نے یزید کے اس خط کو ٹھکرادیا اور امام حسینؑ کی شہادت پر اپنے غم و غصے کا اظہار کر کے یزید پر بہت لعن طعن کی۔

اس واقعہ شہادت سے صاف ظاہر ہے کہ یزید سیاسی ضرورتوں اور تقاضوں سے نابلد نہ تھا لیکن جوں ہی امام حسینؑ کا مسئلہ سامنے آتا وہ ایک مختلف سطح پر عمل شروع کر دیتا وجہ اس کی یہ نہ تھی کہ اس کی مت ماری گئی تھی بلکہ بات نظریات، تصورات، کردار اور رجحانات کی دو الگ دنیاؤں کی تھی، دو ضدین کی تھیں اور جب نسبت ضدین کی ہو تو پھر سیاست ختم اور جنگ کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ باالفاظ دیگر یوں کہیے کہ یزید بھی امام حسینؑ کی طرح اقتدار کی جنگ نہیں لڑ رہا تھا۔ اقتدار کی جنگ ہمیشہ پہلے سیاست کی بساط پر اور آخر میں قتل و خونریزی کے میدان میں لڑی جاتی ہے۔ لیکن انتقام وعداوت کی جنگ بادشاہ صرف لاشوں پر لڑتے ہیں۔ اس کے مقابل اصولوں کی جنگ لڑنے والے سیاسی بساط سے شروع ہو کر شہادت کے میدان میں پہنچتے ہیں یوں کربلا کی جنگ نہ امام حسینؑ کی صرف سے اقتدار کی جنگ تھی نہ یزید کی طرف سے۔ امامؑ اصولوں کی خاطر شہادت کی طرف بڑھ رہے تھے اور یزید نفرت وانتقام کے جذبے میں دیوانہ ہو کر قدم بڑھا رہا تھا۔ کربلا کی جنگ کسی اعتبار سے

اقتدار کی جنگ نظر نہیں آتی۔

یکساں مثالیں

اقتدار کی جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے اس کی مثال خود امام حسینؑ کے زمانے میں موجود ہے۔ صرف زمانے میں نہیں، امامؑ کے جیسے حالات میں بھی۔ یہ جنگ حضرت عبداللہ ابن زبیر نے لڑی۔ وہ واضح طور پر تختِ دمشق پر قبضہ کرنا چاہتے تھے چنانچہ یزید کے باپ نے ان سے خبردار رہنے کا صاف مشورہ دیا تھا۔ عبداللہ ابن زبیر مکے میں پناہ لینے آئے تھے۔ یزید کے خلاف بغاوت کرنے آئے تھے۔ چنانچہ وہ آخر تک مکہ میں مقیم رہے تا ایں کہ یہیں سے علمِ بغاوت بلند کیا۔ امام حسینؑ کو بھی انکا مشورہ یہی تھا کہ وہ مکے ہی میں مقیم رہیں اور کہیں باہر نہ جائیں لیکن امامؑ نے یہ کہہ کر مشورہ مسترد کر دیا کہ حرمتِ کعبہ اور احترامِ مکہ کا مقدم رکھنا سب سے ضروری امر ہے۔ مطلب اس کا کیا ہوا۔ کیا یہ کہ مکے کے تقدس کے پیشِ نظر وہاں اعلانِ بغاوت نہیں کیا جا سکتا۔ حسینؑ نے یہ غلط فہمی بھی دور کر دی، امامؑ نے فرمایا:

> خدا کی قسم میں ایک قدم مکے کی حدود سے باہر قتل کیا جاؤں مجھے زیادہ پسند ہے بجائے اس کے کہ ایک بالشت بھر مکے کی حدود کے اندر مارا جاؤں اور قسم خدا کی اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں جا کر رہوں، تب بھی یہ لوگ مجھ کو وہاں سے باہر لے آئیں گے۔ یہاں تک کہ جیسا چاہتے ہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔

یعنی یہاں سوچ کی سطح شہادت کی سطح ہے۔ امام حسینؑ کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ